آخر الاعمال

(منتہائے اعمال)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱	تمہید	۷
۲	ابتدائی اور انتہائی درجہ کے بیان کی وجہ	۸
۳	اہمیت توبہ	۹
۴	شبہ کا جواب	۱۰
۵	ضرورت توبہ	۱۲
۶	گھر کی تعمیر میں اہتمام تکمیل	۱۲
۷	دین کے بارے میں لاپرواہی	۱۴
۸	طالب دین کا حال	۱۴
۹	طالب دُنیا کا حال	۱۴
۱۰	دین اور دنیا کے اہتمام میں لوگوں میں فرق	۱۵
۱۱	شوق کا کمال	۱۶
۱۲	حصول علم کا شوق	۱۷
۱۳	نزع کی تکلیف کی حقیقت	۱۸
۱۴	اولیاء کے مختلف اقوال	۱۹
۱۵	کاملین کا حال	۲۰
۱۶	کتابوں کا شوق	۲۰
۱۷	تعلیم دین سیکھنے والوں کے لئے کھانے پینے کا عجیب اہتمام	۲۱
۱۸	خیرات دینے میں کمی نہ کرے	۲۱
۱۹	اہل اللہ کی سادگی	۲۲

۲۰	آج کل کے دیندار	۲۲
۲۱	تفہیم دین میں ہماری حالت	۲۳
۲۲	دین کے بعض اجزاء پر قناعت کی مثال	۲۴
۲۳	دین میں ترقی کی فکر کسی کو نہیں	۲۵
۲۴	بعض گناہوں سے بچنے اور بعض گناہوں سے نہ بچنے کی وجہ	۲۶
۲۵	خاندانی وضع کی وجہ سے ترک گناہ	۲۷
۲۶	ترقیٔ دین میں لاپرواہی	۲۸
۲۷	اہمیتِ دین	۲۸
۲۸	دین کی حقیقت	۲۹
۲۹	دین نام اعمال کا ہے اس کی ضرورت تاحیات ہے	۳۰
۳۰	بناوٹی پیروں کی مثال	۳۱
۳۱	مجاہدے کی لذت کی مثال	۳۲
۳۲	درجہ ولایت کا ثبوت	۳۲
۳۳	ولایت کا حصول اختیاری ہے	۳۳
۳۴	اولیاء اللہ کو مشقت میں بھی لطف آتا ہے	۳۳
۳۵	ایک اللہ والے کا قصہ	۳۴
۳۶	نماز روزہ کی لذت کا حال	۳۵
۳۷	عاشق کا حال	۳۶
۳۸	بے نمازی پیروں کا حال	۳۷
۳۹	حقیقی اہل اللہ کا حال	۳۸
۴۰	ترکِ اعمال خلاف عقل وفطرت ہیں	۳۸
۴۱	اعمال کی انتہاء نہیں	۳۹
۴۲	عامل کو دین سے کبھی سیری نہیں ہوتی	۴۰
۴۳	سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کے معنی	۴۱

۴۴	تعیین بیان	۴۳
۴۵	اللہ کی مہربانی	۴۴
۴۶	اللہ کی مہربانی کا مقتضاء	۴۵
۴۷	حقیقی دوستی کی مثال	۴۶
۴۸	اللہ سے محبت کا مقتضاء	۴۷
۴۹	بخیل کا قصہ	۴۸
۵۰	نوکر کی بہانہ بازی	۴۸
۵۱	اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا برتاؤ	۴۹
۵۲	عاشق کا حال	۵۰
۵۳	ہماری مِلک کی حقیقت	۵۱
۵۴	اللہ کے ساتھ بیع وشراء کی حقیقت	۵۲
۵۵	حصول علم میں ترتیب	۵۳
۵۶	علم تصوف کے حصول کا طریقہ	۵۴
۵۷	انتخاب پیر میں احتیاط	۵۵
۵۸	قرآن وحدیث میں علوم تصوف	۵۵
۵۹	خودساختہ تصوف	۵۶
۶۰	طالبان خدا کی مثال	۵۷
۶۱	عشق حقیقی کا حال	۵۸
۶۲	تصوف کی حقیقت	۵۹
۶۳	تصوف کی اصطلاح ''مقام'' کی حقیقت	۶۰
۶۴	خوارق عادت کا حصول سلوک نہیں	۶۱
۶۵	حصول مقامات میں ترتیب	۶۱
۶۶	مقامات کا آخری درجہ اور اس کی تعریف	۶۳
۶۷	راضی برضاء الٰہی کا مطلب	۶۴
۶۸	خوشی اور غمی کا اجتماع ممکن ہے	۶۴

۶۹	رضاء میں منتہی اور متوسط کا فرق	۶۶
۷۰	منتہی کی مثال	۶۹
۷۱	اہل اللہ کی پہچان کا طریقہ	۶۹
۷۲	متوسط اور منتہی کی حالت میں فرق	۷۰
۷۳	سب سے بڑی نعمت	۷۱
۷۴	مقام رضاء جنت میں یقینی ہے	۷۲
۷۵	شریعت پر عمل سب کے لئے ضروری ہے	۷۲
۷۶	آداب کی رعایت	۷۳
۷۷	اولیاء اللہ پر مواخذہ	۷۳
۷۸	حصول تصوف کے لئے محنت ومشقت	۷۴
۷۹	تصوف میں مقام فناء	۷۵
۸۰	مجاہدے کا فائدہ	۷۶
۸۱	بدنظری کے نقصانات	۷۷
۸۲	مقام فناء کی تعریف	۷۸
۸۳	سالکین کی غلطی کا ازالہ	۷۹
۸۴	سالک کا پسندیدہ حال	۸۰
۸۵	وحدت الوجود کا مطلب	۸۰
۸۶	فناء کے درجے	۸۱
۸۷	مقام عبدیت	۸۲
۸۸	مقام محبوبیت	۸۳
۸۹	تصوف کی اصطلاح ”مقام“ کے مختلف نام اور اس کی تشریح	۸۳
۹۰	دین میں اعلیٰ درجہ کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے	۸۴
۹۱	آیت سے مسائل تصوف کا اثبات	۸۵
۹۲	خلاصۂ مقصود	۸۶

وعظ

آخر الاعمال

(منتہائے اعمال)

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے منتہائے اعمال کے متعلق یہ وعظ ۲۰/ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ بمطابق ۴/ جنوری ۱۹۱۸ء جامع مسجد کانپور میں منبر پر کھڑے ہوکر تقریباً پونے تین گھنٹے ارشاد فرمایا۔

جس میں فرمایا کہ دین اعمال کا نام ہے مجاہدات کا نہیں، مجاہدات تو مقدمات ہیں اعمال کے لئے مگر مجاہدات کی انتہاء نہیں ہوسکتی اسی لئے دین کا اہتمام کسی وقت نہ چھوٹنا چاہیئے۔

سامعین کی تعداد تقریباً دو ہزار تھی، محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس وعظ کو قلم بند فرمایا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتو کل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَؤُوفٌ بِالْعِبَادِ ﴾(۱)

تمہید

یہ آیت ان آیتوں میں سے ایک ہے جن کو میں نے پرسوں شب چہارشنبہ(۲) کے بیان(۳) میں پڑھا تھا اور ان سے ایک مضمون تو مدلولاً اور دوسرا مضمون استنباطاً(۴) ثابت کیا تھا کہ اعمال میں بعضے ابتدائی ہیں اور بعض انتہائی اور اس بیان میں اول مرتبہ کی تعیین بھی کردی گئی تھی کہ وہ توبہ ہے اور اس کو عقلاً ونقلاً ثابت کردیا تھا اور یہ بھی کہا گیا تھا کہ یہ جلسہ اس سے زیادہ کے لئے کافی نہیں ہوسکتا لہذا معذوری ہے اور صرف ابتدائی عمل کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے نیز ایک اور جلسہ کی بھی امید تھی اس واسطے بھی ایک ہی جزو کے بیان پر کفایت کی گئی ہے، چنانچہ بحمداللہ اب اس کی نوبت آ گئی۔

(۱) ''اور بعضے آدمی ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک صرف کرڈالتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں'' سورۂ بقرہ:۲۰۷ (۲) بدھ کی رات (۳) وعظ ''اول الاعمال'' میں (۴) ایک مضمون پر آیت کی دلالت اور دوسرا مضمون اس سے مستنبط کیا تھا۔

ابتدائی اور انتہائی درجہ کے بیان کی وجہ

اب دوسرے جزو کو یعنی اعمال کے انتہائی درجہ کو عرض کرتا ہوں اور اس بیان میں یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ جزو کی تعیین سے غرض ایک غلطی کی اصلاح ہے وہ یہ کہ جب تک ابتداء کسی طریقہ کی معلوم نہ ہو تو وہ کام صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ ابتدائی جزو بمنزلہ بنیاد اور اساس (۱) کے ہوتا ہے جس مکان کی بنیاد متزلزل ہو اس مکان کا کیا اعتبار ہے، عمارت کی خوبصورتی اور نقش ونگار وغیرہ سب بے کار ہیں۔ اس کے بقاء وثبات کی امید نہیں اسی طرح اس مرتبۂ انتہائی کے بیان سے ایک غرض ہے کہ اگر انتہا کسی چیز کی معلوم نہ ہو تو امتیاز ترقی کا کوئی رخ نہیں ہوتا آج اس مرتبۂ انتہا کی تعیین پر بحث ہے۔

اور اس مرتبۂ ابتدا کی تعیین کے لئے جس طرح تلاوت کردہ آیات کی تائید کے لئے ایک آیت یہ بھی پڑھی تھی جس میں مومنین کی صفات مذکور ہیں ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (۲) اس میں بہت سی صفات مذکور ہیں مگر سب پر مقدم کیا ہے: ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ﴾ کو اس سے توبہ کے اول الاعمال ہونے کی بھی تائید ظاہر ہوتی ہے چنانچہ: ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ﴾ کو: ﴿عَابِدُوْنَ﴾ پر بھی مقدم کیا گیا پھر آگے تو عبادت کی تفصیل ہی ہے اسی طرح ایک آیت اس کی تائید کے لئے اس وقت اور یاد آئی اس کو بھی اُس بیان میں ملحق کردیا جاوے وہ یہ ہے:

(۱) جڑ (۲) ''وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں عبادت کرنے والے حمد کرنے والے روزہ رکھنے والے رکوع اور سجدہ کرنے والے نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے اور بُری باتوں سے باز رکھنے والے اور اللہ کی حدوں کا خیال رکھنے والے اور ایسے مومنین کو آپ خوشخبری سنادیجئے'' سورۂ توبہ: ۱۱۲۔

﴿عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا﴾(۱)

اس میں بھی ﴿تٰٓئِبٰتٍ﴾ مقدم ہے: ﴿عٰبِدٰتٍ﴾ پر اُن آیات سے اور ان مؤیدات سے (۲) بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ توبہ جملہ عبادات پر مقدم ہے تو توبہ اول الاعمال ہوئی اور اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بلا توبہ کے کوئی عبادت صحیح نہیں ہوسکتی کبھی کوئی اس غلطی میں پڑ جاوے کہ ہم سے گناہ تو پورے طور سے چھوٹتے نہیں اور عبادت بلا گناہوں سے توبہ کئے صحیح نہیں ہوسکتی تو نماز روزہ وغیرہ سے بھی کیا فائدہ بس ان کو بھی چھوڑ دینا چاہیئے کیونکہ اگر ان کو کرتے رہیں اور صحیح نہ ہوئے تو مفت تکلیف اٹھائی۔

اہمیتِ توبہ

بلکہ معنی یہ ہیں کہ بلا توبہ کے عبادات کامل نہیں جیسے وہ مثال میں نے دی تھی کہ توبہ کو عبادات کے ساتھ نسبت بنیاد اور تعمیر کی سی ہے تعمیر چل تو سکتی ہے بلا استحکام بنیاد کے بھی مگر اس کی حالت یہ ہے کہ ایک دفعہ بھی کوئی قصہ پیش آیا مثلاً بارش زیادہ ہوئی یا زلزلہ آیا تو سب ایک دم غارت (۳) اور یہی وجہ تھی اس کے بیان کی تاکہ یہ عام غلطی رفع ہوجاوے کہ لوگ عبادات میں کوشش کرتے ہیں اور ان کو دیکھ کر خوش بھی ہوتے ہیں مگر بنیاد کو مستحکم نہیں کرتے اس واسطے کبھی اُن پر ایک ایسی آفت آجاتی ہے کہ سب ندارد ہوجاتی ہے اور اس وقت حسرت ہوتی ہے کہ

---

(۱) ''اگر پیغمبر (ﷺ) تم عورتوں کو طلاق دیدیں تو ان کا پروردگار بہت جلد تمہارے بدلے اُن کو تم سے اچھی بیبیاں دے دیگا جو اسلام والیاں، ایمان والیاں فرمانبرداری کرنے والیاں توبہ کرنے والیاں عبادت کرنے والیاں روزہ رکھنے والیاں ہوں گی کچھ بیوہ اور کچھ کنواریاں'' سورۂ تحریم: ۵ (۲) ان تائیدات کے (۳) ایک دم ختم۔

تمام عمر کوشش کی مگر یہ کیا ہوگیا، بے قاعدہ کوشش کا انجام یہی ہوتا ہے موٹی سی بات ہے کہ مکان کی بنیاد اگر پوری طرح مستحکم نہیں ہے اور اس کی تعمیر میں لاکھوں روپیہ لگادیا گیا اور عمدہ سے عمدہ مسالا لگایا گیا لیکن وہ زلزلہ کا متحمل نہیں ہوسکتا(۱) اور ضرور خوف ہے کہ انجام اسکا حسرت وافسوس ہے۔ غرض یہ خیال تو غلط ہے کہ جب تک پوری طرح توبہ نہ کی جائے کوئی عبادت ہی نہ کریں یہ تو کید نفس (۲) ہے کہ اس حیلہ (۳) سے وہ عبادت سے بھی روکنا چاہتا ہے معاصی (۴) میں تو مبتلا تھے ہی عبادات سے بھی محروم رہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اور اعمال کے ساتھ توبہ بھی کرنی چاہیئے اس سے غفلت کیوں ہے۔

غرض توبہ کا ضروری ہونا ثابت کیا گیا تھا اور تائید اس کی اس آیت سے کی تھی اور اس وقت یہ آیت بھی تائید کے لئے یاد آئی۔

شبہ کا جواب

ہاں اس آیت پر ﴿عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ﴾ الخ پر ایک شبہ ہے وہ یہ کہ اس میں: ﴿تٰٓئِبٰتٍ﴾ کا لفظ: ﴿عٰبِدٰتٍ﴾ پر تو مقدم ضرور ہے جس سے توبہ کا مقدم ہونا عبادت پر نکلتا ہے مگر اول الاعمال ہونا توبہ کا اس سے نہیں نکلتا کیونکہ اس سے بھی مقدم چند الفاظ ہیں اور وہ یہ ہیں: ﴿مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ﴾ ترتیب کے لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ چوتھے مرتبہ میں درجہ ﴿تٰٓئِبٰتٍ﴾ کا ہے توبہ کا اول الاعمال ہونا جب مستنبط ہوتا (۵) جب کہ آیت: ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ﴾ کی طرح اس میں بھی سب سے مقدم: ﴿تٰٓئِبٰت﴾ ہوتا۔

اس کا جواب بہت ظاہر ہے کیونکہ میں نے اُس بیان میں تصریح کردی تھی

(۱) زلزلہ کے جھٹکے برداشت نہیں کرسکتا (۲) نفس کا دھوکا (۳) اس بہانے (۴) گناہوں (۵) (۶) توبہ کا اول الاعمال ہونا جب صحیح ہوتا کہ۔

کہ توبہ کے اول الاعمال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بجز ایمان واسلام کے اور سب اعمال پر مقدم ہے اور ان دونوں کا مقدم ہونا تو مسلّم ہے کیونکہ یہ تمام اعمال کی صحت کے لئے شرط ہیں ان کے بغیر تو اعمال خواہ کیسے ہی اچھے ہوں ایسے ہوتے ہیں جیسے ایک باغی ہو کہ رعایا کی بہت خدمت کرے اور بڑے بڑے کارنمایاں کرے چندہ رفاہ عام بھی بدرجہ وافر دے (۱) اور قحط وغیرہ میں بہت امداد دے مگر ہے باغی، تو یہ سب کام اس کے بیکار ہیں کوئی بھی ان میں سے سلطنت کی نظر میں کچھ شمار نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ بغاوت سے رجوع نہ کرے (۲) اسی طرح ایمان واسلام ہے کہ کوئی عمل بدون (۳) ان کے صحیح بھی نہیں نورانیت تو الگ رہی۔

تو اس آیت میں تین لفظ ہیں جو ﴿تٰٓئِبٰتٍ﴾ پر مقدم ہیں یعنی: ﴿مُّسْلِمٰتٍ﴾ اور ﴿مُّؤْمِنٰتٍ﴾ اور ﴿قٰنِتٰتٍ﴾ ﴿مُّسْلِمٰتٍ﴾ اور ﴿مُّؤْمِنٰتٍ﴾ کی وجہ مقدم تو ظاہر ہے صرف: ﴿قٰنِتٰتٍ﴾ میں شبہ رہا اس کا جواب یہ ہے کہ قنوت ایک خاص وجہ سے توبہ سے مقدم ہے اس واسطے کہ توبہ ندامت کو کہتے ہیں اور ندامت جب ہوگی جبکہ تعب قنوت (۴) ہو کیونکہ جب تک نرمی اور جھک جانا اور عجز قلب میں نہ ہو تو کسی فعل پر ندامت کیوں ہونے لگی اور یہی ترجمہ ہے قنوت کا تو توبہ ہمیشہ قنوت کے بعد ہوگی تو عقلاً ثابت ہوگیا کہ توبہ کی شرط قنوت ہے اس واسطے ﴿قٰنِتٰتٍ﴾ کو بھی اس آیت میں: ﴿تٰٓئِبٰتٍ﴾ پر مقدم کیا تو حاصل یہ ہوا توبہ کے اول الاعمال ہونے کا ان اعمال سے جن پر توبہ مبنی نہیں ہے ان سب سے مقدم توبہ ہے باقی قنوت چونکہ توبہ کے لئے شرط عقلی ہے لہذا توبہ پر مقدم ہوئی اور ان کے سوا باقی اعمال پر توبہ مقدم ہے۔

---

(۱) رفاہ عامہ کے کاموں میں چندہ بھی خوب دے (۲) بغاوت سے باز نہ آئے (۳) بغیر ان کے (۴) جب تک عاجزی کی مشقت برداشت نہ کرے۔

ضرورتِ توبہ

پہلے جلسہ میں حاصل کلام یہ تھا کہ توبہ کمال اعمال کے لئے شرط ہے اور اس میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ تمام اعمال کا تو اہتمام ہوتا ہے مگر توبہ کا اہتمام نہیں ہوتا نماز پڑھیں روزہ رکھیں مگر مبتلا ہیں معاصی میں جیسے حسد، غیبت، مال حرام، جھوٹ، حب دنیا، ناشکری بے صبری، غرض معاصی ظاہری و باطنی سب ہی تو موجود ہیں طاعات کے ساتھ یہ معاصی گویا منجیات کے ساتھ مہلکات بھی ہیں (۱) اور زروجواہر کے ساتھ بڑے بڑے بچھو اور اژدھے بھی ڈسنے والے جمع ہیں اگر انہوں نے کسی دفعہ ڈس لیا تو زروجواہر سب دھرے ہی رہ جاویں گے (۲) زروجواہر سے تو تمتع (۳) جب ہی ہوسکتا ہے کہ ان کو الگ کیا جاوے ورنہ کچھ بھی نہیں مال ودولت سے کیا حظ پاسکتا ہے (۴) وہ شخص جس کے بدن پر سینکڑوں سانپ بچھو لپٹے ہوئے ہیں اس سے وہ غریب اچھا ہے جو فاقہ کرتا ہے مگر سانپ بچھو اس کے بدن پر نہیں لپٹے ہوئے ہیں کیونکہ اس کی جان ہر وقت خطرہ میں تو نہیں ہے۔

گھر کی تعمیر میں اہتمام تکمیل

پرسوں کے بیان کا حاصل اسی کی شکایت تھی کہ اعمال کے ساتھ ان کا ابتدائی واساسی (۵) درجہ کیوں نہیں ہے آج انتہائے اعمال کا بیان ہے اور اس بیان کی بھی ایک غایت اور غرض ہے اور وہ شکایت ہے اس بات کی کہ دنیا کے کام ہم کس طرح کرتے ہیں کہ مرتبۂ انتہائی سے قبل بس نہیں کرتے (۶) بلکہ مراتب

(۱) نجات دینے والے اعمال کے ساتھ ہلاک کرنے والے اعمال بھی ہیں (۲) سب بیکار پڑے رہ جائیں گے (۳) فائدہ جب ہی اٹھایا جاسکتا ہے (۴) کیا لطف حاصل کرسکتا ہے (۵) بنیادی (۶) اس کام کی تکمیل سے پہلے نہیں رکتے بلکہ اس کی تزئین بھی کرتے ہیں۔

مابعد کی تکمیل بھی کرتے ہیں مثلاً مکان بناتے ہیں تو بنیاد ڈال کر نہیں چھوڑ دیتے بلکہ دیواریں بناتے ہیں اور چھت پاٹتے ہیں(۱) چونہ گچ سے بھی اس کو درست کرتے ہیں اوپر بالاخانہ بھی بناتے ہیں ہر موسم کے لئے متعدد کمرے بناتے ہیں گرمی کے لئے تہہ خانہ اور برسات کے لئے بالاخانہ اور جاڑے کے لئے آتشدان وغیرہ(۲) سب ہی سامان پورا کرتے ہیں اور تار بجلی لگاتے ہیں اور ضرورت تک بھی تعمیر محدود نہیں رہتی چھت پاٹ دی بالاخانہ بن گیا مگر اس کے چھت کے آس پاس بھی پردے کی دیوار کو اونچا کرتے ہیں(۳) تاکہ کبھی دل چاہے تو اوپر کھلی ہوا میں سوسکیں اور اس میں بھی ایک فرضی ضرورت اور نکالی جاتی ہے کہ یہ دیوار اُس طرف دیکھنے سے مانع ہوگی ممکن ہے کہ کبھی پڑوسیوں سے بات کرنی پڑے یا ہوا کی زیادہ ضرورت ہو اس واسطے اس میں کھڑکی بھی رکھتے ہیں۔

غرض مکان کی تعمیر میں بعید سے بعید ضرورتوں کا بھی خیال کرتے ہیں اور ان سب سے اس کو مکمل کرتے ہیں جہاں برقی سامان ہے وہاں روشنی بھی برقی لیتے ہیں(۴) اور پنکھا بھی بجلی کا لگاتے ہیں پانی کا نل بھی مکان میں لگاتے ہیں پھر یہ بھی نہیں کہ تعمیر کا کام بھی ختم ہو جاوے ہمیشہ اس میں کچھ نہ کچھ ترمیم اور اضافہ کرتے رہتے ہیں بلکہ تمام عمر اسی میں لگے رہتے ہیں اور کام کو ختم نہیں کرتے اور ذرا سی کوئی کوتاہی سمجھ میں آجاوے تو اس کے دور کرنے اور مکان کو مکمل کرنے کے لئے تا باختیار آمادہ ہو جاتے ہیں(۵) مگر تعمیر کو نامکمل نہیں دیکھ سکتے برابر یہی دُھن رہتی ہے(۶)۔

(۱) چھت ڈالتے ہیں (۲) سردی کے لئے ہیٹر وغیرہ (۳) چھت ڈالی گئی اس پر ایک کمرہ بھی بنایا اور پھر چھت پر چار دیواری بھی کردی گئی (۴) بجلی کے آلات ہیں (۵) اپنے اختیار کی بقدر ہمیشہ تیار رہتے ہیں (۶) ہمیشہ اسی فکر میں رہتے ہیں۔

دین کے بارے میں لاپرواہی

اب میں پوچھتا ہوں کہ دین کی تکمیل میں ایسی دُھن کیوں نہیں ہے بس یہی شکایت ہے اور اسی پر تو ہم کہتے ہیں کہ دین کی پرواہ نہیں دیکھ لیجئے جس کی پرواہ ہے اس کے ساتھ کیا معاملہ ہے یہ تو اجمالی شکایت ہے اور تفصیلی شکایت یہ ہے کہ دین کے بارے میں دو طرح کی لاپرواہی ہے ایک تو بنیاد کا اہتمام نہیں جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ بنیاد تو یہ ہے اس کی ضرورت ہی کم لوگوں کے ذہن میں ہے دوسرے یہ کہ اعمال کا گو بُرا بھلا اہتمام ہو مگر ان میں ترقی کا اہتمام نہیں نہ کماً نہ کیفاً(۱) مثلاً نماز پڑھتے ہیں اور روزہ رکھتے ہیں تو جس طرح سے ایک دفعہ کر دیا ہے اسی طرح کئے جاتے ہیں۔

طالبِ دین کا حال

اگر دُھن ہوتی تو فرائض اور سنن پر بس کر کے نہ رہ جاتے نماز نفل بھی پڑھتے روزہ بھی نفل رکھتے قرآن بھی پڑھتے تجوید کی بھی کچھ مشق کرتے ''دلائل الخیرات'' بھی پڑھتے اور مثلاً ''مناجات مقبول'' کی منزل بھی شروع کر دیتے ''حزب البحر'' بھی پڑھتے ''تسبیح فاطمہ'' بھی ہوتی کوئی وظیفہ بھی پڑھتے (وظیفہ دین کے لئے مراد ہے دنیا کے لئے نہیں یہ تو آجکل بہت ہے) دعا بھی مانگا کرتے غرض جس کو سنتے جاتے کہ یہ بھی دین کا کام ہے اسی کو لیتے جاتے۔

طالبِ دنیا کا حال

اور وہ حالت ہوتی جیسے کسی سخت مرض کے مریض کی ہوتی ہے کہ کوئی بھی

(۱) اعمال کا اگرچہ تھوڑا بہت اہتمام ہے لیکن اُسمیں ترقی کا اہتمام نہیں ہے نہ مقدار کے اعتبار سے نہ معیار کے اعتبار سے۔

طبیب مل گیا اس سے نسخہ پوچھ لیا کوئی قرابادِین مل گئی اور کسی نسخہ کی تعریف دیکھی تو داشتہ آید بکار اسی کی نقل کرلیا(۱) حتی کہ کسی عطائی ہی سے (۲) اگر نسخہ سن لیا تو اسی کو یاد کرلیا مرض کے ازالہ کی فکر کی دُھن لگی ہوتی ہے اور کہتا ہے جوینده یابنده (۳) کیا عجب ہے کہ کوئی نسخہ کامل مل ہی جاوے اور مرض کے جانے کا وقت آ گیا ہو، دُھن اس کو کہتے ہیں دین میں اس کا کہیں نام ونشان بھی نہیں پھر کیسے کہا جاوے کہ دین کی پرواہ ہے۔

دین اور دنیا کے اہتمام میں لوگوں میں فرق

یہ تو کمیۃً ترقی کی صورت ہوئی اور کیفاً ترقی یہ کہ جیسے مکان کی تعمیر کرتے ہیں اور کمیۃً میں وہ پورا ہوجاتا ہے یعنی جتنے کمرے اس میں ہونے چاہیئے تھے وہ سب پورے بن گئے غسل خانہ بھی پائخانہ بھی نشست بھی کوٹھری بھی کوٹھا بھی باورچی خانہ بھی تو اب اس پر بس نہیں کی جاتی اب اس میں استر کاری کی جاتی ہے پنڈول پوتا جاتا ہے یا قلعی کی جاتی ہے (۴) اور اس کو بھی کسی معمولی درجہ میں نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ اس اصلاح کیفیت کا بھی خاص طور سے اہتمام کیا جاتا ہے حتی کہ بعض وقت اس کے واسطے اصل عمارت میں ترمیم کی جاتی ہے مثلاً مکان کے کسی کمرہ میں بعد تیار ہوجانے کے ثابت ہوا کہ روشنی کم ہے گو ضرورت کے لئے کافی ہو مگر دیوار کو توڑ کر کھڑکی بنائی جاتی ہے اور کہتے ہیں کہ اس کی بڑی کمی تھی روشنی تو تھی ہی نہیں یہ ترقی فی الکیفیت ہی تو ہے ہم نے کسی کو نہیں دیکھا کہ اس کھڑکی کے کھولنے سے بھی ہمت ہاری ہو اور دل کو سمجھا لیا ہو کہ ضرورت کے موافق تو سارے

(۱) کوئی طب کی کتاب مل گئی اس میں کوئی مفید نسخہ دیکھا تو فوراً اس خیال سے نقل کرکے رکھ لیا کہ وقت ضرورت کام آئے گا (۲) بناوٹی حکیم (۳) جس نے کوشش کی سو پالیا (۴) نقش و نگار بنائے جاتے ہیں ڈسٹمپر اور پینٹ کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

کام ہو ہی گئے ہیں ایک کھڑکی نہیں ہے نہ سہی۔

اور دین میں یہ حالت ہے کہ نماز ہے مگر خشوع نہیں ہے کسی کو یہ خیال نہیں کہ اس کی بھی فکر کروں یا روزہ رکھتے چلے آئے ہیں مگر روزہ ناپاک ہے اور غیبت اور مال حرام وغیرہ سے احتراز نہیں ہے تو خیال ہوا ہو کہ اس کو پاک کرلوں یا اتنا ہی کرتے ہوں کہ نماز میں قل ہواللہ پڑھتے ہیں اس کو کسی قاری سے درست کرلوں یہ ہے ترقی کیفیت کی اللہ کے بندے بہت ہی کم ہیں جن کو دُھن ہو۔

شوق کا کمال

دُھن کے لفظ پر یاد آیا ایک میرے ابتدائی کتابوں کے استاد تھے ان کو دو چیزوں کی دُھن تھی (۱)۔ ایک تو کتابوں کی، آٹھ دس روپے تنخواہ تھی حالانکہ بڑے عالم تھے اور صاحبِ کمال بزرگ تھے مگر قناعت تھی آٹھ دس روپے کی اوقات ہی کیا ہے مگر کتابوں کے شوق کا یہ حال تھا کہ جو کتاب بھی ملتی پیٹ کاٹتے اور فاقے کرتے مگر اس کو ضرور بہم پہنچاتے جب ان کی وفات ہوئی تو تین ہزار روپے کی کتابیں ان کے گھر میں سے نکلیں اور لکھنے کا شوق تھا حالانکہ کم سوجھ تھے (۲) آنکھ سے کاغذ کو ملا کر لکھا کرتے تھے مگر بہت کتابیں لکھ ڈالیں حسب روایت ان کے ایک عزیز کے کہ ایک گلستان ان کے کتب خانہ میں ان کے ہاتھ کی ایک رات کی لکھی ہوئی نکلی (یہ کرامت ہے) سو اسی دُھن کی بدولت ایک آٹھ روپیہ کی اوقات والے آدمی نے تین ہزار کی کتابیں جمع کرلیں۔

دوسری دُھن ان کو تحصیل علم کی تھی جہاں کہیں کسی صاحب کمال کو سنتے وہیں پہنچتے مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری کے پاس حدیث کی سند لینے گئے حالانکہ سند خود

(۱) دو چیزوں کا شوق تھا (۲) کم نظر آتا تھا۔

کو بھی حاصل تھی کیونکہ عالم تھے مگر برکت کے لئے سند عالی کا شوق ہوا تو اب سند کیسے حاصل ہو مدرسہ میں نوکر تھے نوکری چھوڑیں تب سند لیں مگر شوق عجیب چیز ہے کام کے طریقے سکھا دیتا ہے تھانہ بھون سے سہارنپور چوبیس کوس ہے(۱) یہ ترکیب نکالی کہ مدرسہ کا مہینہ چوبیس دن کا ہوتا ہے کیونکہ یقینی تعداد دنوں کی اونتیس ہوتی ہے ان میں سے کم از کم چار جمعہ تعطیل(۲) کے نکل گئے اور ایک دن امتحان کا نکل گیا پانچ دن نکل گئے تو چوبیس رہے تو مولانا نے یہ ترکیب کی جمعہ کی تعطیل نہ کرتے اور متصل چوبیس دن پڑھاتے اور وہ سب تعطیلیں ایک دم سے لے لیتے دو روز آنے جانے میں لگتے اور چار دن متواتر سہارنپور میں پڑھتے اسی طرح مہینوں تک پڑھا اور آخر سند حاصل کر ہی لی اس کو کہتے ہیں دُھن جس کو دُھن ہوتی ہے وہ کام کر ہی گذرتا ہے اور اس حکایت سے مولانا کی بے نفسی اور تواضع بھی کسی درجہ معلوم ہوئی کہ باوجود عالم ہونے کے پھر طالب علم بن گئے آج ہم کو ترجمہ کرنا بھی آجاوے تو طالب علم بننا گوارا نہیں ہوتا اور کسی کے سامنے کتاب رکھنا تو درکنار کوئی مسئلہ پوچھے تو اس سے لاعلمی ظاہر کرنے سے عار آتی ہے(۳) یہ قصہ تو میرے سامنے کا ہے۔

حصول علم کا شوق

اور ایک قصہ مولانا کا مجھ سے پہلے کا ہے وہ یہ ہے کہ ایک بزرگ حافظ عبدالرزاق صاحب جھنجھانہ میں تھے وہ مثنوی کے حافظ تھے اور ان کو فیض مولانا الٰہی بخش صاحب سے ہوا تھا جو خاتم مثنوی ہیں اور ان کو فیض مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی روح سے ہوا تھا تو حافظ عبدالرزاق صاحب مولانا کے شاگرد ہوئے اور مثنوی سے اسقدر تعشق تھا حافظ صاحب کو کہ ہر شخص کو پڑھانے کو آمادہ ہوجاتے اور خود لوگوں کو

(۱) ایک کوس تین ہزار گز کا ہوتا ہے تو یوں چوبیس کوس بہتر ہزار گز ہوئے جن کی مقدار تقریباً 66 کلومیٹر یا 41 میل بنتی ہے (۲) چھٹیوں کے (۳) شرم آتی ہے۔

لپٹتے کہ مثنوی پڑھ لو یہاں تک کہ کریما پڑھنے والے لڑکوں سے کہتے میاں مثنوی پڑھ لو جیسے کریما پڑھی ایسے ہی مثنوی پڑھ لو مثنوی میں اور کیا دقت ہے، غرض مثنوی کے مشہور استاد تھے ہمارے حضرت حاجی صاحب نے اور پیرانی صاحبہ نے دونوں نے مثنوی انہیں سے پڑھی تھی۔ یہ مولانا جھنجھانہ حافظ صاحب کے پاس مثنوی پڑھنے کو جاتے اور تمام مثنوی انہیں سے پڑھی اس طرح کہ جمعرات کے دن دوپہر کو مدرسہ کی چھٹی کر کے جاتے اور جھنجھانہ میں مسجد میں یا قبرستان میں پڑے رہتے (کیا زندگی ہے اہل اللہ کی اتنے بڑے اہلِ کمال اور مگر کسی پر بھی ظاہر نہیں اپنے کام سے کام) رات اس طرح گذارتے اور جمعہ کے دن صبح سے بیٹھتے اور عصر تک برابر پڑھتے بس جمعہ کی نماز کے لئے تو اُٹھتے ورنہ ہمہ تن استاد شاگرد دونوں سبق میں مشغول رہتے اور عصر پڑھ کر واپس ہوتے اور عشاء کی نماز تھانہ بھون میں آپڑھتے (۱)۔ سالہا سال تک یہی معمول رہا حتی کہ مثنوی ختم کرلی ختم کے قریب ایک مرتبہ حافظ صاحب نے فرمایا کہ ابھی معتدبہ (۲) حصہ باقی ہے تھوڑی رخصت لے کر اس کو ختم کرلو چنانچہ مہینہ ڈیڑھ مہینہ کی رخصت لی اور وہاں قیام کر کے مثنوی تمام کی (۳) اِدھر مثنوی ختم ہوئی اُدھر حافظ صاحب کا انتقال ہوگیا یہ مصلحت تھی حافظ صاحب کے جلدی کرنے میں کہ معلوم ہوگیا تھا کہ وفات قریب ہے کیا شفقت ہے اہل اللہ کی کہ پورا کام کر کے تشریف لے گئے۔

نزع کی تکلیف کی حقیقت

اہل اللہ کو اپنے متوسلین سے بے حد تعلق ہوتا ہے یہاں سے اس کا راز بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو نزع کی جو تکلیف (۴) زیادہ ہوئی بعض لوگ شدت

(۱) تھانہ بھون آکر پڑھتے (۲) کافی مقدار باقی ہے (۳) مکمل کرلی (۴) روح نکلنے کی تکلیف۔

نزع کو ناپسند کرتے ہیں اور اس کو علامتِ بد(۱) سمجھتے ہیں حالانکہ اس کی کچھ بھی اصل نہیں اس کی وجہ اہلِ تحقیق نے یہ بیان کی ہے کہ اس کی بنا شدت تعلقات پر ہے (۲) تعلق جسمانی ہو یا روحانی جسمانی یعنی رطوبات اصلیہ زیادہ ہوں جیسے بچوں میں یا پہلوانوں میں دیکھا ہوگا کہ بچوں کو نزع کی تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے حالانکہ انہوں نے ابھی گناہ کونسا کیا ہے اور مدقوق کو (۳) بالکل نہیں ہوتی کیونکہ رطوبات ان میں باقی نہیں رہتیں۔ تارکین کو نزع کی تکلیف کم ہوتی ہے خواہ وہ بُرے ہوں یا اچھے ہوں کیونکہ ان کو تعلق روحانی نہیں ہے چونکہ انبیا علیہم السلام کو امت سے بہت تعلق ہوتا تھا (تعلق شفقت کا نہ جائیداد اور مال کا) اس وجہ سے نزع کی تکلیف اُن کو زیادہ ہوتی ہے اور اس واسطے انبیا علیہم السلام نے اپنی حیات کو پسند کیا ہے کہ خلق کو نفع پہنچے۔

اولیاء کے مختلف اقوال

اس طرح بعض اولیاء کو بھی متوسلین سے تعلق ہوتا ہے اور ان کو بھی متعلقین کے نقصان سے تکلیف ہوتی ہے البتہ بعضے اولیاء آزاد بھی ہوتے ہیں جیسے مولانا احمد جام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار　　دیوانہ باش سلسلہ شد شد نہ شد نہ شد (۴)

اور بعضوں کو جن کا ذکر اولاً ہوا ہے خدمت خلق میں بڑا انہماک ہوتا ہے وہ یوں کہتے ہیں ؎

طریقت بجز خدمت خلق نیست　　بہ تسبیح و سجادہ ودلق نیست (۵)

---

(۱) بُری (۲) بنیاد تعلق کی مضبوطی پر ہے (۳) جس کو تپ دق کا مرض ہو (۴) ''احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام دیوانہ ہو جا سلسلہ ہوا ہوا نہ ہوا نہ ہوا'' (۵) ''طریقت خدمت خلق کا نام ہے تسبیح مصلّٰی اور گدڑی کو نہیں کہتے''۔

اوران دونوں میں سے اکمل وہ ہی ہے جس کی حالت انبیاء علیہم السلام کی سی ہو کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی حالت تو کامل ہی تھی دیکھئے احمد جام رحمۃ اللہ علیہ نے تو کہہ دیا ''بمشیخت تراچہ کار''

کاملین کا حال

مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسا نہیں فرماسکتے آپ کو تو نفع رسانی خلق میں اس قدر شغف تھا(۱) کہ خود حق تعالیٰ آپ کو خطاب فرماتے ہیں: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (۲) یعنی آپ شاید جان دیدیں گے اس رنج میں کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے اس سے صاف ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نفع رسانی میں اتنا شغف تھا کہ اپنی جان کی بھی پرواہ نہ تھی، غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ فرمادیا کہ چولہے میں جاویں ایمان لاویں یا نہ لاویں۔ اسی طرح کاملین کو اپنے متوسلین سے عشق ہوتا ہے اور کوئی خیر خواہی ان سے اٹھا نہیں رکھتے، تو مشورہ حافظ صاحب کا مولانا کو اس شفقت پر مبنی تھا چنانچہ کتاب کو پورا کراکر وطن تشریف لے گئے یہ قصہ اس واسطے بیان کیا گیا کہ اندازہ ہو کہ شوق اس کو کہتے ہیں۔

کتابوں کا شوق

اسی طرح کتابوں کا مولانا کو بے حد شوق تھا اور یہ نہیں کہ خاص ان کتابوں کی کچھ ضرورت تھی چنانچہ ایک کتاب بہت قیمتی منگائی اور خوشی خوشی مجھ سے کہا کہ لو تم دیکھنا اس کتاب کو بس مجھے دیدی، بعض لوگوں نے کہا کہ جب آپ دیکھتے بھی نہیں ہیں تو پھر کیا شوق ہے کتاب کے منگانے کا، کہا کیا بتاؤں ایک لت (۳) ہے جیسے کسی کو پتنگ بازی کی لت ہوتی ہے کسی کو مرغ بازی کی لت ہوتی ہے مجھے

(۱) لوگوں کو فائدہ پہنچانے کا اہتمام تھا (۲) ''شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دیدیں'' سورۂ شعراء:۳ (۳) عادت۔

کتابوں کی لت ہے۔ کسی نے کہا کہ اتنی کتابیں جمع ہوگئی ہیں ان کی حفاظت مشکل ہے کیا ہوگا سوائے اس کے کہ منتشر ہوں فرمایا کہ کتاب ایسی چیز ہے جہاں جاوے گی کام ہی آوے گی غرض دُھن اس کو کہتے ہیں سو بتلایئے کسی اللہ کے بندے کو اپنے دین کی تکمیل کی بھی دُھن ہوتی ہے۔

تعلیم دین سیکھنے والوں کے لئے کھانے پینے کا عجیب اہتمام

اسی طرح مولانا کو قرأت سیکھنے کا شوق ہوا پانی پت پہنچے اور مہینوں پڑے رہے حالانکہ معیشت کا کچھ سامان نہ تھا عجیب قصہ ہے مولانا اتنے بڑے شخص مگر ظاہری شان وشوکت کچھ بھی نہیں کسی نے بات بھی نہ پوچھی حتیٰ کہ تکلیف ہونے لگی خدا کی قدرت ایک آدمی محلّہ میں مرگیا وہاں دستور تھا کہ چالیس دن تک ایک غریب آدمی کو کھانا دیتے تھے وہ کھانا مولانا کے لئے آنے لگا ایک چلہ تک سامان ہوگیا ابھی چلہ پورا نہ ہوا تھا کہ ایک اور مرگیا چالیس دن کا رزق اور اتر آیا ابھی یہ چلہ بھی ختم نہ ہوا تھا کہ اور ٹہل گیا(۱) غرض ان کی روٹیوں کا سامان ہوتا رہا قاری صاحب نے کہا ان کا کھانا مقرر کردو ورنہ سارے محلّہ کو اسی طرح کھا جائیں گے لوگوں نے کھانا مقرر کردیا بس سکون ہوگیا۔

خیرات دینے میں کمی نہ کرے

کبھی محتاج کو دینے میں کمی نہ کرے اور حق تعالیٰ کے ساتھ بدگمانی نہ کرے وہاں جو کچھ لینا منظور ہے اس کا ٹوٹل پورا کرلیتے ہیں جب کوئی یوں نہیں دیتا ہے تو اور طرح وصول کرتے ہیں تو پھر ویسے ہی کیوں نہ دیدیں۔

(۱) مرگیا۔

اہل اللہ کی سادگی

مولانا کا ایک اور قصہ ہے کتابوں کی دُھن کا، ایک ڈپٹی نصر اللہ خاں صاحب تھے انہوں نے ایک کتاب فن رنگریزی میں لکھی تھی اسکا نام ''نموالصباغین'' تھا وہ ہاتھ پڑگئی اسی کو نقل کرلیا وہ مولانا کے کتب خانہ میں موجود تھی بہشتی زیور کے دسویں حصہ میں رنگ کے نسخے میں نے اسی سے لکھے ہیں اس کو دیکھ کر کوئی ناواقف کہے کہ مولانا کو بڑی حرص تھی مگر نہیں ان کے افعال اور طرز معاشرت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کام بھی ان کے دنیا کے لئے نہ تھے اور نفع رسانی خلق مقصود تھی کیونکہ اعمال میں یہ حالت تھی دین کے غلبہ کی کہ مولانا پَیر پھیلا کر کبھی نہ سوتے تھے بس سکڑے سکڑائے پڑے رہتے تھے اور ذاکر شاغل بہت تھے مگر حالت یہ تھی کہ اللہ اللہ کرتے اور ذرا کوئی اٹھا اور مولانا چپکے لیٹ گئے تاکہ ظاہر نہ ہو کہ ذکر کررہے تھے اور کبھی کھانا اچھا ہوتا تو طلباء کو کھلا دیتے اور بچا کھچا خود کھالیتے ایسے شخص کی نسبت کیسے خیال ہوسکتا ہے کہ دنیا کی حرص تھی۔

یہ قصے ہیں دُھن کے دین کی دُھن ایسی ہونی چاہیئے جب ترقی ہوتی ہے اور ترقی کرنے والے کو تو کسی حالت پر وقوف (۱) نہیں ہوسکتا جیسے تعمیر کے شوقینوں کی حالت آپ دیکھتے ہیں کہ ہمیشہ توڑ پھوڑ لگی رہتی ہے مگر دین میں ایسے بہت کم ہیں جن کو دُھن لگی ہوئی ہو۔

آج کل کے دیندار

اور شوق نہ ہونے ہی کا یہ اثر ہے کہ لوگوں کو پورے دین سے واقفیت بھی نہیں ایک ایک جزو کو ہر شخص نے لے رکھا ہے اور خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں کسی کو نماز کا شوق ہے مگر روزہ نہیں، کوئی روزہ رکھتا ہے مگر حج نہیں کرتا کبھی یہ بھی نہیں آتا

(۱) ترقی کرنے والا کسی حالت پر رکتا نہیں۔

کہ حج ہمارے اوپر فرض ہے، کوئی حاجی بھی ہوگیا ہے مگر حقوق کی پرواہ نہیں حقوق کو بہت لوگ یہی سمجھے ہوئے ہیں کہ دین کو ان سے کیا تعلق یہ تو آپس کی باتیں ہیں۔

تفہیمِ دین میں ہماری حالت

دین کے تجربہ میں ہماری بالکل وہ حالت ہے کہ اندھوں کے شہر میں ایک ہاتھی آگیا تھا اس کے دیکھنے کے لئے بہت سے اندھے جمع ہوئے آنکھیں تو تھی ہی نہیں ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا کسی کا ہاتھ پیٹ پر پڑا اور کسی کا دُم پر، کسی کا کان پر، کسی کا پیروں پر، کسی کا کمر پر، پھر سب جمع ہوئے اور آپس میں پوچھ گچھ ہوگئی کہ ہاتھی کیسا تھا جس کا ہاتھ سونڈ پر پڑا تھا اس نے کہا ہاتھی ایسا تھا جیسے سانپ اور جس کا ہاتھ دم پر پڑا تھا اس نے کہا ایسا تھا جیسے مورچھل، ایک بولا ایسا تھا جیسے تخت، ایک بولا ایسا تھا جیسے کھمبے، غرض خوب سب میں لڑائی ہوئی غور سے دیکھا جاوے تو نزاع لفظی تھا اور سب کے سب جھوٹے تھے اور سب کے سب سچے۔ سچے تو اس طرح تھے کہ جو ان کو ٹٹولنے سے معلوم ہوا وہ کہا اس میں جھوٹ کیا ہے اور جھوٹے اس طرح کہ ہاتھی کو اُسی شکل میں محدود کیوں مان لیا جو اپنے ٹٹولنے میں آئی تھی (۱) یعنی جزو کو کل کیوں سمجھ لیا ہاتھی ایک جزو کا نام نہیں ہے (۲) اگر سب یوں کہتے کہ ایک ایک جزو ہم نے دیکھا ہے اور ان سب کو ملا کر ہاتھی ہوتا ہے تو نزاع نہ رہتا یہی گت ہم نے دین کی بنائی ہے کہ ایک ایک جزو کو لے رکھا ہے اور اپنے کو دیندار سمجھتے ہیں اور پھر اُس جزو میں دین کو ایسا منحصر سمجھتے ہیں (۳) کہ جس جزو کا نام دین رکھا ہے جس میں وہ جزو نہ ہو اس کو بے دین سمجھتے ہیں اور اس کی تحقیر کرتے

(۱) اپنے ہاتھ سے دیکھنے سے معلوم ہوئی تھی (۲) ہاتھی تو اس پورے مجموعہ کا نام ہے اپنی عقل کے مطابق ایک جزو کو ہاتھی قرار دینا غلط ثابت ہوا (۳) محدود۔

ہیں میں پوچھتا ہوں کہ چند آدمی کُرتہ پہننا چاہیں تو کیا یوں ہوگا کہ ایک نے دامن لیا اور ایک نے آستین ہاتھ میں ڈال لی اور ایک نے گلا پہن لیا ایسی تقسیم کرنے کے بعد ہر شخص کو یہ خیال کرنا درست ہوگا کہ میں نے کُرتہ پہن لیا ہے ان میں سے تو ایک نے بھی کُرتہ نہیں پہنا کُرتہ تو دامن اور آستین اور گلے سب کا نام ہے جس نے سب اجزا پہنے ہوں اس کو کرتے والا کہا جاوے گا۔

دین کے بعض اجزا پر قناعت کی مثال

اسی طرح دین والا وہ ہے جس میں تمام اجزاء دین کے موجود ہوں نہ کہ کوئی ایک جزو اور اس غلطی میں کم وبیش ایک عالم کا عالم مبتلا ہے(۱) اول تو ایک ایک جزو کو لے رکھا ہے اور وہ جزو بھی نا تمام ہے مثلاً جو لوگ نماز روزہ کے پابند ہیں اور کبھی ناغہ نہیں کرتے اور دیندار کہلاتے ہیں ان کو بھی ان اعمال کے بعض اجزاء معلوم ہیں خشوع نہیں خضوع نہیں(۲) دیکھ لیجئے کتنے دیندار ایسے ہیں جن کی نماز میں خشوع وخضوع ہوتا ہے اس کی طرف سے تو ایسی بے حسی ہوتی ہے کہ وضو اور نماز کے ظاہری احکام تو پوچھے جاتے ہیں مگر یہ کبھی نہیں پوچھا جاتا کہ خشوع اور خضوع کیا چیز ہیں اور وہ کسی طرح حاصل ہوسکتے ہیں یا نہیں اور چونکہ ان کے جزو ہونے کا خیال بھی نہیں ہے اس واسطے اسی جزو ناقص کو بڑا کمال سمجھتے ہیں اور دوسروں کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھتے ہیں، کیا علاج کیا جاوے اس کی کسی کو فکر نہیں ایک صاحب دل اسی کی شکایت کرتے ہیں ؎

ریا حلال شمارند وجام بادہ حرام زہے شریعت وملت زہے طریقت وکیش(۳)

زاہدانِ خشک کو کہتے ہیں کہ ان کے نزدیک شراب تو حرام ہے اور ریا

(۱) تقریباً سب لوگ مبتلاء ہیں (۲) وہ بھی بعض اجزا نماز کے ادا نہیں کرتے جیسے خشوع اور خضوع (۳) ''ریا کو حلال شمار کرتے ہیں اور شراب کو حرام، کیا شریعت وملت اور تصوف وطریقت یہی ہے''۔

جیسا بدترین گناہ جس کو شرک خفی فرمایا گیا ہے (۱) حلال ہے اس میں برابر مبتلا ہیں اور کبھی کان پر جوں بھی نہیں رینگتی (۲) حضرت اپنے زہد و طاعت پر نہ پھولئے ہم سِوالوں کی یہ حالت ہے (۳) کہ ظاہر میں تقویٰ طہارت ہے اور مولوی عالم ہیں اور شیخ ہیں سب ہی کچھ ہیں اور باطن کی خبر خدا ہی کو ہے جس قدر ظاہر میں ہنر ہیں اس سے زیادہ باطن میں عیب بھرے ہوئے ہیں بالکل یہ حالت ہے

از بروں چوں گور کافر پر حلل — واندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بربایزید — وزد رنت ننگ می دارد یزید (۴)

دین میں ترقی کی فکر کسی کو نہیں

بات کیا ہے وہی کہ دین میں کتر بیونت کی ہے (۵) کوئی عمل ہے کوئی نہیں اور جو عمل ہے بھی اس کا بھی ایک جزو ہے ایک نہیں اور اکثر یہ ہے کہ اجزاء میں سے بھی اگر کوئی جزو ہے تو جزو زائد باقی اصلی اور جزو اعظم ندارد (۶) غرض ہر عمل کی ایک صورت ہوتی ہے اور ایک قلب اور روح ہوتی ہے صرف صورت کو لے لیا اور اس کی پراہ نہیں کہ روح بھی ہے یا نہیں۔ پھر جسقدر بھی دین کو لیا وہ بے پرواہی کے ساتھ نہ اس میں ترقی کیفیت کی کرتے ہیں نہ ترقی کمیت کی (۷) بس جتنا آسانی سے حاصل ہوگیا وہ لے لیا اور زیادہ کو سمجھ لیا کہ بکھیڑا ہے یا یہ کہ جس کی

(۱) جس کو پوشیدہ شرک قرار دیا ہے (۲) اور کبھی احساس بھی نہیں ہوتا (۳) ہم جیسوں کا یہ حال ہے (۴) کافر کی قبر پر باہر سے خوب پھولوں کے ہار اور باجے گانے ہیں۔ اور اندر خدائے عزوجل کا عذاب ہو رہا ہے باہر سے تو بایزید بسطامیؒ جیسے بزرگ پر طعنہ زنی کرتے ہو۔ اور تمہاری اندرونی حالت سے شیطان بھی شرماتا ہے (۵) دین میں کاٹ تراش کی ہے (۶) جو جزو زائد ہے اس کا تو اہتمام ہے اور جو اصل جزو ہے اس کا کوئی اہتمام نہیں (۷) نہ اسکے معیار بہتر کرنے کی فکر ہے نہ مقدار بڑھانے کا خیال۔

عادت پڑگئی وہ لے لیا۔ باقی خود دین کے واسطے عادت بدلنے کی ضرورت نہ سمجھی آخر کیا وجہ ہے کہ بعض لوگ شراب تو پیتے ہیں مگر جوا نہیں کھیلتے اور جوئے کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں اور جواریوں کی صحبت سے دور بھاگتے ہیں اور کبھی نام بھی آتا ہے تو کہتے ہیں ارے میاں مسلمانوں کو تو خدا اُس فعل سے محفوظ ہی رکھے اور ایسے بھی بہت سے ہیں کہ شراب بھی نہیں پیتے اور جوا بھی نہیں کھیلتے اور دیندار سمجھے جاتے ہیں اور خود بھی اپنی طرف گمان نیک رکھتے ہیں اور واقعی ان پر کسی کو حرف گیری کی گنجائش ہے بھی نہیں (۱)۔

بعض گناہوں سے بچنے اور بعض گناہوں سے نہ بچنے کی وجہ

مگر بعض خفیہ گناہوں میں مبتلا ہیں جس کی خبر اپنے ہم جنسوں کو بھی نہیں اور اس وجہ سے اُن کی نظر اُن پر اچھائی کے ساتھ پڑتی ہے وہ گناہ مثلاً بدنگاہی ہے (۲) کہ اس کے کرنے میں اس قدر سہولت ہے کہ چلتے چلتے کرلیا اور کسی کو شبہ بھی نہ ہوا ان کو معلوم ہے یا خدا کو معلوم ہے سب گناہوں سے بری ہیں مگر اس کو نہیں چھوڑتے ان کے نفس میں یہ چور موجود ہے کہ اگر شراب کو اور جوئے کو خوف خدا سے چھوڑا ہے تو تکنا کیوں نہیں چھوڑا (۳) خدا کے نزدیک تو یہ بھی گناہ ہے اور جیسے شراب کو خدا نے منع کیا ہے ایسے ہی اس کو بھی تو منع کیا ہے بس وجہ اصلی یہ ہے کہ ان گناہوں کی عادت نہیں۔ اور خاندان کی وجاہت کو ان سے بٹہ لگتا ہے (۴) اس واسطے نہیں کرتے باقی گھورنے سے خاندان کی بدنامی نہیں یہ کام تو باپ دادا

(۱) کسی کو ان پر اعتراض کا حق بھی نہیں (۲) عورتوں کو شہوت سے دیکھنا (۳) عورتوں کو دیکھنا کیوں نہیں چھوڑا (۴) خاندان کی عزت پر حرف آتا ہے۔

نے بھی کیا تھا دوسرے کسی کو اطلاع بھی نہیں اس لئے اس سے شان میں فرق نہیں آتا لہذا اس سے چنداں احتراز بھی نہیں۔

خاندانی وضع کی وجہ سے ترکِ گناہ

بس معلوم ہوا کہ اصلی معنی شان ہے جو گناہ شان کے خلاف ہوا وہ چھوڑ دیا اور نام نہاد کے لئے خدا کے خوف کا لفظ بھی لگالیا اور جو شان کے خلاف نہ ہو وہاں خوف خدا کوئی چیز نہیں یا ایسے ہزاروں شرفاء ہیں کہ چال چلن ان کا درست ہے آوارگی کے پاس نہیں ہیں کبھی ساری عمر زنا نہیں کیا مگر غیبت میں بے دھڑک مبتلا ہیں حالانکہ یہ اس سے بدتر ہے تصریحاً حدیث میں وارد ہے: ((اَلْغِیْبَۃُ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا))(۱) سو پھر وجہ کیا ہے صرف یہی کہ غیبت سے آدمی بدنام نہیں ہوتا تمام عمر غیبت کرتے رہو مگر بزرگ کے بزرگ اور زنا سے بدنامی ہوتی ہے ان کاموں میں پڑنا خاندانی وضع کے خلاف ہے غرض اصل چیز لوگوں کے نزدیک خاندانی وضع ہے وضع ٹھیک ہو اور بس، اس کا یہ مطلب نہیں کہ وضع کا ٹھیک رکھنا کوئی چیز نہیں اور خواہ مخواہ وضع کا بگاڑو، وضع کا ٹھیک رکھنا بھی مطلوب ہے آدمی اگر وضع ہی کے خیال سے زنا جیسے گناہ سے بچ گیا تو کیا بُرا ہے بچ تو گیا مطلب یہ ہے کہ صرف وضع کو مطمح نظر نہ بناؤ وضع کے ساتھ شریعت کا بھی خیال رکھو یعنی شریعت کا بھی ایسا ہی خیال رکھو جیسے وضع کا جس طرح وضع کے خیال سے بعض گناہ سے بچتے ہو تو شریعت اور خوفِ خدا کے خیال سے سب گناہوں سے بچو، غرض ہمارے برتاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف خدا سے تو ترک معاصی ہے نہیں جن معاصی کو چھوڑا گیا ہے ان میں اور کوئی وجہ ہے ورنہ گناہ سب متساوی الاقدام تھے(۲) ایک کو چھوڑنا اور دوسرے کو باقی رکھنا کیا معنی اور وہ وجہ وہی وضع اور عادت کا لحاظ اور دین سے

(۱) ''غیبت زنا سے بھی زیادہ بُری ہے'' (۲) ورنہ گناہ سب چھوڑنے کے قابل ہیں۔

لاپرواہی ہے اگر دین کی پرواہ ہوتی تو اول تو گناہ ہوتا ہی نہیں اور بمقتضائے بشریت گناہ ہو بھی جاتا تو اس کی تلافی تو کرتے (۱) مگر پرواہ ہی نہیں۔

ترقیٔ دین میں لاپرواہی

بس قناعت ہے جیسی عادت ہوگئی ہوگئی، افسوس یہ ہے کہ دنیا کے کسی کام میں قناعت نہیں حتی کہ کپڑوں میں بھی نہیں۔ ضرورت کے موافق کپڑا موجود ہے مگر پچھلے سال کا بنایا ہوا ہے تو افسوس سے کہتے ہیں کہ اب کے سال ہاتھ ایسا تنگ ہے کہ بَنڈی اور اچکن بھی نہ بن سکی (۲) مکان میں قناعت نہیں اتنا بھی تو نہیں کرتے کہ ہمیشہ قلعی پوتی جاتی ہے (۳) اب کے سال نہ سہی قلعی میں کیا کھانا ہے، بس بے فکری ہے تو دین سے ہے اور قناعت کا کوئی موقع ہے تو دین ہی ہے نہ اسمیں کسی قسم کی ترقی کی فکر نہ اس کے نقصان کی پرواہ ایک پیسہ جاتا رہے تو دل دکھتا ہے اور دین ڈھیروں غارت ہوجائے اور ہوتا ہے تو ''خبرے نباشد'' (۴)۔ گویا دین بزبان حال کہتا ہے ؎

قلق از سوزش پروانہ داری ولے از سوز ما پروانہ داری (۵)

اہمیتِ دین

کیا دین ایسی چیز ہے جس کی پرواہ نہ کی جاوے آپ جانتے بھی ہیں دین کیا چیز ہے دین تعلق مع اللہ کا نام ہے کیا کسی کو ہمت ہے کہ دل کھول کر کہہ دے کہ تعلق مع اللہ باقی رکھنے کی چیز نہیں غرض ہم لوگوں کو پرواہ نہیں کہ ہم دین میں کس حالت میں ہیں۔

---

(۱) انسان ہونے کے ناطے گناہ ہوجاتا تو اس کا تدارک تو کرتا (۲) واسکٹ اور شیروانی بھی نہ بنا سکے (۳) ہمیشہ برتنوں پر پالش کرائی جاتی اس دفعہ نہ ہو تو کیا حرج ہے (۴) دین سارا بھی ضائع ہوجائے تو کوئی فکر نہیں (۵) ''پروانہ کے کاٹے سے تو دکھ اور تکلیف کا گلہ کرتا ہے، اور ہمارا دل دکھانے کا خیال اور پرواہ بھی نہیں کرتا''۔

یہ ہے وہ شکایت جس کے لئے یہ جلسہ تجویز ہوا ہے اور جس کا رفع کرنا ضروری ہے اور صورت اس کی یہ ہے کہ انتہائی مرتبہ دین کا معلوم ہوجائے کہ وہاں تک پہنچے بغیر دین کی تکمیل ہی نہ ہوگی جب یہ معلوم ہوجائے گا تو آدمی اس سے اِدھر بس نہ کرے گا چنانچہ ظاہر ہے کہ جو شخص دہلی جانے والا ہے اس کو برابر چلنا چاہیئے جب تک کہ دہلی نہ آجاوے اور اس کو دہلی کی علامات بتانا چاہئیں تاکہ جب تک وہ علامات نہ نظر آجاویں چلنا بند نہ کرے ورنہ وہ درمیان ہی میں رہ جاوے گا جس جگہ کو بھی دہلی سمجھ لے گا وہیں بس کردے گا۔ لہذا انتہائی مرتبہ دین کا بتانا ضروری ہے بعض لوگوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ مجاہدہ کرتے ہیں اور جب کسی خلق کی تکمیل یا کسی رذیلہ کا ازالہ میں کامیابی ہوجانے کے بعد مجاہدہ کم کرادیا جاتا ہے تو وہ سمجھ لیتے ہیں کہ اب ہم کامل ہوگئے بس دین کا اہتمام کم کردیتے ہیں۔

دین کی حقیقت

ان کو سمجھ لینا چاہیئے دین نام اعمال کا ہے مجاہدات کا نہیں ہاں مجاہدات مقدمات ہیں اعمال کے لئے تو مجاہدات کی تو انتہا ہوسکتی ہے مگر اعمال کی انتہا نہیں ہوسکتی سو دین کا اہتمام کسی وقت نہ چھوٹنا چاہیئے اس کی توضیح اس مثال سے ہوگی کہ مکان جس وقت تعمیر کیا جاتا ہے تو اس کی طرف کس قدر توجہ کی ضرورت ہوتی ہے تاوقتیکہ وہ مکمل نہ ہوجاوے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بعد مکمل ہوجانے کے اب اس کی طرف توجہ نہ چاہیئے۔ ورنہ اس کے تو معنی یہ ہوں گے کہ مکان کو بنا کر معطل چھوڑ دیا جائے حتی کہ اس میں رہا سہا بھی نہ جاوے اور سمجھ لیا جاوے کہ غرض تو حاصل ہوگئی یعنی تعمیر ختم ہوگئی اب اور کیا کام مکان سے باقی رہا، نہیں! بلکہ ہمیشہ اس کی طرف توجہ رکھنی پڑے گی ہاں فرق ہوگا دونوں وقت کی توجہ میں اس

وقت میں توجہ تھی اس کی تکمیل کی طرف اور اب توجہ ہوگی اس کی بقا اور استحصالِ غرض کی طرف (۱) مکان بنانے کے بعد آدمی کا دل چاہتا ہے کہ اُس میں رہوں اور اس کی ہوالوں اور جو غرض تھی تعمیر سے وہ حاصل کروں۔ غور سے دیکھئے تو حقیقی توجہ یہی ہے اور پہلی توجہ تو اس کا مقدمہ تھی۔ ایسے ہی دین کی طرف ایک وقت میں توجہ تھی بغرض تکمیل کے اور بعد تکمیل توجہ چاہیئے اس کا لطف حاصل کرنے کے لئے وہ توجہ مجاہدہ تھی اور یہ توجہ مشاہدہ ہے مجاہدہ کرنے سے تو محض تکمیل ہوئی ہے دین کی، باقی دیندار ہونے کا وقت تو ابھی آیا ہے تو کیا اس کے معنی ہوں گے کہ یہاں پہنچ کر دین کو چھوڑ دیا جاوے؟

دین نام اعمال کا ہے اس کی ضرورت تاحیات ہے

دیکھئے کوئی لباس بناتا ہے اور اس کا انتہائی مرتبہ اس کو معلوم ہے تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ اس مرتبہ پر پہنچ کر اس کو چاہیئے کہ لباس کو چھوڑ دے اور ننگا کھڑا ہوجاوے یا یہ معنی ہیں کہ اس سے متمتع ہو (۲) ہم نے تو کسی کو نہیں دیکھا کہ لباس تیار ہوجانے کو انتہائی مرتبہ سمجھ کر اس کو تہہ کر کے رکھ دیا ہو اور پہنا نہ ہو۔ بیوقوف سے بیوقوف بھی اس بات کو جانتا ہے کہ سلائی کا اخیر تو ہوگیا مگر اصل غرض تو اب شروع ہے اور اس کے لئے خاتمہ کہیں نہیں جب تک کہ کپڑے کا وجود ہے اور دین میں ایسے عقلمند بہت ہیں کہ انتہائی مرتبہ تک پہنچ کر بالکل چھوڑ دیا اور سمجھتے ہیں کہ ہم فنا ہوگئے اب ہمیں اعمال کی ضرورت نہیں رہی چنانچہ اس خیال کے لوگ موجود ہیں کہ کسی مرتبہ میں پہنچ کر اپنے آپ کو آزاد سمجھنے لگتے ہیں۔ اور شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں اور نہ نماز کے نہ روزہ کے، معتقدین کہتے ہیں کہ فقیر کی فقیر ہی

(۱) اس کے قائم رکھنے اور اس کے غرض کے حصول کی طرف توجہ ہوگی (۲) اس سے فائدہ حاصل کرے۔

جانے (۱)۔ شاہ صاحب تو دراصل ہو چکے ہیں اب ان کو محنت کی کیا ضرورت، تعجب ہے شاہ صاحب نے لباس کو نہ چھوڑ دیا انتہائی مرتبہ پر پہنچ کر۔

بناوٹی پیروں کی مثال

ہمارے یہاں کا ایک قصہ ہے کہ ایک شخص نے مکان بنانا چاہا مگر روپیہ نہ تھا اس واسطے ایک مہاجن (۲) سے قرض لیا اور مکان بنالیا چند روز کے بعد مہاجن نے تقاضا شروع کیا کچھ دنوں تو لیت ولعل سے (۳) ٹالا جب زیادہ تقاضا ہوا تو آپ نے کیا کیا کہ غصہ میں آکر مکان کو کھود ڈالا کہ ہم قرض کا مکان ہی نہیں رکھتے جو تقاضا ہو، اپنے نزدیک تو انہوں نے تقاضے کی جڑ ہی کاٹ دی کیونکہ مکان ہی کی بدولت تقاضا ہوا تھا اسی کو ندارد کر دیا (۴)۔ لیکن درحقیقت تقاضا تو بدستور رہا اور مکان بھی ہاتھ سے گیا ایسے ہی شاہ صاحب کو اپنے زعم میں مرتبہ انتہائی حاصل ہوا گویا دین کا مکان تیار ہوا اب وقت تو آیا تھا اس میں رہنے کا اور متمتع ہونے کا (۵) مگر اس مکان کو گرا دیا کہ روزہ نماز چھوڑ دیا۔ ہر چیز کا وجود اس کے اجزا ہی سے ہوتا ہے جب دین کے اجزاء نماز روزہ نہ رہے تو دین کا وجود کہاں رہا یہ مکان کا گرانا ہی تو ہوا۔

دیکھ لیجئے کہ اس مثال سے اس کو کیا فرق ہے مجاہدہ ختم ہونے کے بعد اعمال دین کو ترک کرنا تو بنائے ہوائے مکان کو گرانا ہے چاہیئے یہ کہ خدا کا شکر کرے کہ محنت ختم ہوئی اور لطف حاصل کرنے کا وقت اب آیا۔

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ نماز روزہ نہیں کرتے تو کوئی بات نہیں ہمارے تو وہ شاہ صاحب ہیں ہمیں ان کی نماز روزہ سے کیا کہنا (۲) بنیئے (۳) ٹال مٹول کرتے رہے (۴) مکان جس کی وجہ سے قرض لیا تھا اس ہی کو ختم کر دیا (۵) نفع اٹھانے کا۔

مجاہدے کی لذت کی مثال

مجاہدہ کا زمانہ لطف کا نہیں ہے بلکہ محنت کا زمانہ ہے گو اس میں بھی لطف ہے اور وہ لطف ایسا ہے جیسے دہلی کی حلیم میں لطف آتا ہے کہ مرچیں اسقدر ہوتی ہیں کہ کھاتے جاتے ہیں اور آنکھ سے اور ناک سے پانی بہتا جاتا ہے یہ پانی بہنا ناگوار اور تکلیف دہ ضرور ہے مگر حلیم ایسے مزہ کی ہے کہ اس کو اس تکلیف کی وجہ سے چھوڑا نہیں جاتا یا جیسے کھجلی کا مزہ کو کھجلاتے کھجلاتے زخم ہو جاتے ہیں مگر اس میں مزہ ایسا آتا ہے کہ چھوڑ نہیں سکتے۔ بعض مشقت میں بھی مزہ ہوتا ہے اسی طرح دین کی مشقت میں بھی مزہ دنیا سے زیادہ ہے اسی واسطے مجاہدِ دین تکلیفیں اٹھاتا ہے اور لذت سے محروم رہتا ہے مگر مجاہدہ کو نہیں چھوڑتا مگر تاہم مجاہدہ ہے محنت ہی جب مقدمہ میں یہ مزہ ہے تو اصل چیز میں کیا مزہ ہوگا۔ میں بتا دوں گا کہ اصل چیز کیا ہے اور وہ کوئی مشکل چیز بھی نہیں بہت لوگ یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ اب اس زمانہ میں وہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی یہ غلط ہے۔

درجہ ولایت کا ثبوت

نبوت تو ایک مرتبہ ایسا ہے کہ ختم ہو گیا باقی ولایت ختم نہیں ہوئی ۔

ہنوز آں ابر رحمت دُرفشاں است   خم وخمخانہ بامہر ونشان است(۱)

اور یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہتا ہوں بلکہ قرآن شریف میں بالتصریح موجود ہے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ (۲)

(۱) ''اب بھی وہ ابر رحمت دُرفشاں ہے خم اور خمخانہ مہر ونشاں کے ساتھ موجود ہے'' (۲) ''یاد رکھو اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں'' سورۂ یونس: ۶۲۔

یہ اولیاء اللہ کے لئے بشارت ہے اور آگے ہی اس کے یہ بھی موجود ہے کہ اولیاء اللہ کون ہیں: ﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ﴾ (۱) اولیاء کون ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور تقویٰ رکھتے ہیں۔

ولایت کا حصول اختیاری ہے

ظاہر ہے کہ ایمان اور تقویٰ فعل اختیاری ہے، اور ولایت اس کے اوپر متفرع ہے تو ولایت بھی اختیاری ہوئی پھر ختم ہوجانا کیا معنی، اب بھی سب کچھ حاصل ہوسکتا ہے اور آسانی سے ہوسکتا ہے یہ دور ہی سے مشکل معلوم ہوتا ہے ورنہ دین تو ایسا خوشگوار ہے کہ کوئی چیز بھی ایسی خوشگوار نہیں ہوسکتی جس کے مجاہدہ میں یہ لطف ہے کہ اس کو آدمی چھوڑ نہیں سکتا تو خود مطلوب میں تو ظاہر ہے جو کچھ لطف ہوگا۔

اولیاء اللہ کو مشقت میں بھی لطف آتا ہے

غرض جب مجاہدہ ختم ہوگا تو لطف دین کا اب آتا ہے نماز جس سے جان چراتے ہیں اور بار سمجھتے ہیں وہ ایسی لذیذ ہوتی ہے کہ بیان میں نہیں آسکتا علیٰ ہذا روزہ بھی ایسا ہی لذیذ ہوتا ہے کہ وہی جانتا ہے جو اس لذت کو پاتا ہے غرض دین ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے ہر چیز لذیذ ہوجاتی ہے حتی کہ بلا اور مرض اور حتی کہ قتل میں بھی بقسم کہا جاتا ہے کہ پریشانی نہیں ہوتی (۲) اس کا مطلب یہ نہیں کہ دینداروں کو مصائب پیش نہیں آتے ان پر بھی سب طرح کی بلائیں آتی ہیں مگر وہ سب صورۃً بلائیں ہوتی ہیں اور حقیقۃً راحت ہوتی ہیں کیونکہ اس کا عقیدہ یہ ہوتا

(۱) ''وہ وہ ہیں جو ایمان لائے اور پرہیز رکھتے ہیں'' سورۂ یونس:۶۳ (۲) قسم کھا کر کہتا ہوں کہ پریشانی نہیں ہوتی۔

ہے بلکہ یہ بات اس کے حال میں داخل ہوجاتی ہے کہ ہر چیز کو وہ محبوب حقیقی کی طرف سے سمجھتا ہے اور محبوب کی کوئی بات بھی محبّ کو ناگوار نہیں ہوتی مصیبت میں وہ کہتا ہے ؎

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یارِ دل رنجانِ من(۱)

اور محبوب سے خطاب کرتا ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو(۲)

تو کسی مصیبت اور تکلیف کی اس کو کچھ بھی پرواہ نہیں ہوتی ہر بات میں خوش رہتا ہے کیونکہ راحت کو بھی عطیہ الٰہی سمجھتا ہے اور مصیبت کو بھی، تو دونوں اس کے نزدیک برابر ہوئے پھر جو حالت راحت میں ہوگی وہی تکلیف میں ہوگی۔

ایک اللہ والے کا قصہ

ایک شخص اللہ والے مریض ہوئے اور ان کو سخت تکلیف تھی مگر میں نے ان کو دیکھا کہ اس حالت میں بھی خوش تھے میں نے پوچھا کیا حال ہے تو بے حد ہنسے۔ تکلیف تو بدن کو محسوس ہوتی ہے مگر دل کھلا جاتا ہے اور کلیجہ اچھلا جاتا ہے اس وقت اگر محبوب اس سے کہے کہ ہم الگ ہوجاویں اور تجھ کو تکلیف نہ دیں تو ہرگز قبول نہ کریں اور بیساختہ کہہ اٹھے ؎

سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیر پائے ہے کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

ایسے شخص کو ہر چیز میں لطف ہے پریشانی تو اس کے پاس بھی نہیں مصائب اس کے لئے ایسے لطف دہ ہیں جیسے ناز محبوب۔

---

(۱) ''تیرا رنجیدہ ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے دل قربان ہے ایسے یار پر جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے''

(۲) ''زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور اگر قتل کریں آپ پر فدا ہوں دل آپ پر فدا ہے جو کچھ کریں میں آپ سے خوش ہوں''۔

نماز روزہ کی لذت کا حال

غرض جب دین ایسی چیز ہے کہ اس کی بدولت مصائب میں بھی لذت آتی ہے تو نماز روزہ میں تو اس کو لذت اور آنکھوں کی ٹھنڈک کیسے نہ ہوگی کیونکہ یہ تو خالص مجالست باللہ ہے(۱) اس کا لطف وہی جان سکتا ہے جس نے کسی محبوب کے نخرے اٹھائے ہوں پھر اس کو مجالست نصیب ہوجاوے(۲) تو اس کی کیا حالت ہوگی محو ہوجائے گا(۳) یہاں سے ان لوگوں کی غلطی کا اندازہ کیجئے جو مجاہدہ سے فراغت کے بعد بیٹھ رہتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حس ہی نہیں ہے (۴) اور مقصود و غیر مقصود میں ان کو تمیز ہی پیدا نہیں ہوئی (۵) جب ہی تو مجاہدہ کو منتہائے نظر سمجھا لطف کا وقت تو ابھی آیا ہے اور یہ اس ذرا سے لطف کو جو مجاہدہ میں تھا اصل لطف سمجھ بیٹھے۔

اے صاحبو اس کی مثال بالکل وہی ہے کہ مکان بنایا اور اس کے واسطے محنت کی اور پریشانیاں اٹھائیں اور جب تیار ہوگیا اور اس میں رہنے کے دن آئے تو گرا بیٹھے ایسے ہی یہ ہے کہ مجاہدے کئے جن سے استعداد پیدا ہوئی اللہ کے نام لینے کی اور دین سے مناسبت پیدا ہوئی اور جب یہ بات حاصل ہوئی تب کام چھوڑ بیٹھے، نماز روزہ بالائے طاق رکھدیا اور کامل بن بیٹھے۔ یہ تو عقل کے بھی خلاف ہے اور محبت کے بھی خلاف یہ تو ایسا ہوا جیسے برسوں تک تلاش اور جستجو کے بعد محبوب نے اپنے پاس رسائی دی بس یہ اس کی صورت دیکھ کر لاحول پڑھ کر بھاگ گئے کیوں صاحب یہ عاشق ہے، تو نماز روزہ شان عشق کے بھی خلاف ہوا عاشق تو وہ ہے کہ ایسے وقت میں کہتا اور آگے آؤ حتی کہ کہتا میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ

(۱) اللہ کی مجلس میں بیٹھنا ہے (۲) جس نے محبوب کے نخرے اٹھائے ہیں پھر جا کر اس کے پاس بیٹھنا نصیب ہوا ہو (۳) اس کے خیال میں کھو جائے گا (۴) احساس ہی نہیں (۵) مقصود اور غیر مقصود میں فرق ہی نہیں کر سکتے۔

لو اور میری کمر پر ہاتھ رکھ لو اور مجھے دبا لو قریب پہنچ کر بھی کہیں سیری ہوا کرتی ہے (۱)

کنار و بوس سے دونا ہوا عشق مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی

عاشق کا حال

عاشق کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ جوں جوں قریب ہوتا جاتا ہے اس کی تڑپ بڑھتی جاتی ہے ایسی ہی حالت کے متعلق کہا ہے ؎

نگویم کہ بر آب قادر نیند کہ برساحل نیل مستسقی اند(۲)

محبوب کے سامنے ہیں مگر تلاش میں باؤلے ہیں ؎

دل آرام در بردل آرام جوئے لب از تشنگی خشک و برطرف جوئے(۳)

محبوب بغل میں ہے مگر دل نہیں بھرتا اور عجیب حالت ہے کہ پاس ہے اور دور ہے حتی کہ شدت شوق میں عین وصل کی حالت میں کہتا ہے ارے فلانے! ارے فلانے! کیا کروں، کوئی پوچھے کس کو پکارتا ہے اس سے وصل نصیب ہے، وجہ یہ ہے کہ جو مرتبہ بھی وصل کا نصیب ہے وہ اس سے بھی اعلیٰ کو چاہتا اور اس کے سامنے اس کو قریب نہیں سمجھتا ہے بلکہ بعید سمجھتا ہے۔ اس واسطے فریاد کرتا ہے یہ ہے شان عشق کی کہ وصل سے متمتع ہے مگر حالت یہ ہے کہ نام لے کر پکارتا ہے نام لینے سے زبان لذت پاتی ہے اور اس کے سننے سے کان لذت پاتے ہیں غرض ہمہ تن اس کے ساتھ مصروف ہے کسی حصۂ بدن کو بھی غیر متمتع رکھنا نہیں گوارا کرتا اگر بس چلے تو دل میں بٹھالے۔

(۱) محبوب کے قریب پہنچ کر بھی کہیں دل بھرا کرتا ہے (۲) میں یہ نہیں کہتا کہ پانی پر قادر نہیں لب دریا ہوتے ہوئے جلندھر کے بیمار کی طرح ہیں (۳) محبوب گود میں ہے اور محبوب کی تلاش کر رہے ہیں۔ نہر کے کنارے پر ہیں اور ہونٹ پیاس سے خشک ہیں۔

غرض عاشق کو قناعت نہیں ہوتی جب دنیا کے محبوبوں کے ساتھ عشق کی یہ شان ہے تو کیا خیال ہے آپ کا محبوب حقیقی کے ساتھ، اس کے طالب کی یہی حالت ہونی چاہیئے کہ جوں جوں بڑھتا جاوے طلب اور بڑھتی جاوے اور ذکر اللہ میں ترقی بھی ہوتی جاوے اور بالکل فنا ہو جاوے ذکر میں۔

بے نمازی پیروں کا حال

نہ یہ کہ مقدمات ہی کو طے کر کے قناعت ہو جاوے اور سمجھ لیں کہ واصل ہو گئے یہ عشق نہیں ہے یہ تو دل لگی اور تمسخر ہے(۱) اس کی تو وہی مثال ہے کہ محنت کر کے محبوب کے دروازہ تک پہنچے اور جب ہی حاضری کا موقع ملا تو لاحول پڑھ کر بھاگ گئے۔ صاحبو! کیا یہ عشق ہے اور کیا اس کو وصول کہتے ہیں ان پر تو محبوب کو وہ غضب ہوگا کہ ساری عمر بھی پاس نہ بھٹکنے دیا جاوے گا بلکہ اس گستاخی کی سزا میں جیل خانہ میں سڑا سڑا کر مار دیا جاوے گا حیرت کی بات ہے کہ ایسے لوگوں کو واصل (۲) سمجھا جاتا ہے ہاں ایک طرح واصل کہیں تو صحیح بھی ہے یعنی واصل جہنم نہ واصل الی اللہ، حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے کہا گیا کہ کچھ لوگ واصل ہونے کے مدعی ہیں اور نماز روزہ کچھ نہیں کرتے تو جواب دیا کہ: ((صَدَقُوْا فِی الْوُصُوْلِ وَلٰکِنْ اِلَی السَّقَرِ)) یعنی سچ کہتے ہیں کہ ہم واصل ہو گئے مگر جہنم واصل ہو گئے نہ واصل الی الجنۃ یا واصل الی اللہ (۳) مگر اس مذاق کے لوگ اب بہت ہیں اور ایسے بیہودوں کے معتقد ہیں اور ان کو خدا رسیدہ سمجھتے ہیں یہ خدا رسیدہ تو کیا ہوتے جہنم رسیدہ البتہ ہونگے۔

(۱) یہ تو ہنسی مذاق ہے (۲) پہنچا ہوا کہا جاتا ہے (۳) سچ کہتے ہیں کہ ہم پہنچے ہوئے ہیں مگر جہنم میں نہ کہ جنت میں۔

حقیقی اہل اللہ کا حال

اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر ہزار برس کی عمر بھی مجھ کو مل جاوے تو بلا عذر شرعی ایک وقت کا وظیفہ بھی قضا نہ کروں یہ ان لوگوں کے اقوال ہیں جو بالاتفاق واصل الی اللہ ہیں کہ ایک وظیفے کو بھی چھوڑنا گوارا نہیں چہ جائیکہ ضروریاتِ دین جیسے نماز روزہ۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں کسی نے تسبیح دیکھی تو عرض کیا کہ اب آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے آپ تو واصل ہو چکے، جواب دیا کہ اسی کی بدولت تو واصل ہوئے پھر کیا ایسے رفیق کو الگ کر دیا جاوے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک پتھر کو دیکھا کہ رو رہا ہے پوچھا کیوں روتا ہے؟ کہا میں نے سنا ہے کہ پتھر بھی دوزخ میں جھونکے جائیں گے اس خوف سے روتا ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس پر بہت رحم آیا اور دعا کی یا اللہ اس کو تو مستثنیٰ ہی کر دیجئے، حق تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور وعدہ کر لیا کہ اس کو جہنم سے بچا دیں گے آپ نے اس کو خوشخبری سنا دی اور آگے چلے گئے، ایک دفعہ پھر ادھر سے گذر ہوا دیکھا کہ وہ اب بھی رو رہا ہے فرمایا اب کیوں روتا ہے؟ اب تو تجھے نجات کا وعدہ مل چکا ہے، کہا اس رونے ہی کی بدولت تو یہ نعمت نصیب ہوئی پھر میں ایسے عمل کو کیوں چھوڑ دوں جس کی یہ برکات ہیں، مولانا نے لکھا ہے کہ اگر ایک دن بلی کو کسی سوراخ میں سے چوہا ہاتھ لگ جاوے تو روز اُسی پر پہنچتی ہے پھر کیا حال ہے اُن طالبین کا کہ بلی کے برابر بھی ان کو حس نہیں۔

ترکِ اعمال خلاف عقل وفطرت ہیں

اور واقعی کیسے حیف (۱) کی بات ہے کہ جس کی بدولت کمال حاصل ہوا سی کو ذبح کیا جاوے اعمال ہی سے توقیر پاویں اور انہیں کو چھوڑ بیٹھیں (۲) عقل کے

(۱) افسوس کی بات ہے (۲) اعمال کرنے کی وجہ سے ہی تو باوقار ہوئے پھر ان کو چھوڑ دیا۔

بھی خلاف قرآن کے بھی خلاف عشق کے بھی خلاف فطرت سلیمہ کے بھی خلاف، قرب میں اور زیادہ قرب کی کوشش کرو قربِ خداوندی کی کوئی انتہا نہیں ان واصلین نے خدا جانے کس چیز کو دیکھ لیا جس کو وصول سمجھ لیا اگر مقصود کو پہنچانتے تو ہرگز نہ ٹھہرتے وہ بہت دور ہے اس تک سعی کبھی ختم نہیں ہوسکتی اصلی چیز کا ان کو پتہ ہی نہیں چلا ہے اور اس کی لذت کا احساس ہی نہیں ہوا ورنہ اس کو چھوڑ نہ سکتے ان کو صرف مجاہدے کے مکدر لطف کا احساس ہوا اور مجاہدہ ختم ہو چکا تو ان کی دوڑ بھی ختم ہوگئی حالانکہ لطف خالص آگے تھا۔

اعمال کی انتہا نہیں

اور میرے اس بیان کو غرض بیان کے منافی نہ سمجھا جاوے کیونکہ غرض بیان یہ بتلائی گئی ہے کہ دین کا منتہا کیا ہے(۱) اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ کوئی منتہا ہی نہیں سو بات یہ ہے کہ جس چیز کا منتہا ہونا بتلاؤں گا اس سے یہ مقصود نہ ہوگا کہ وہاں پہنچ کر کے چھوڑ دے بلکہ اس سے مقصود تو یہ ہے کہ وہاں تک پہنچنے کی لوگ کوشش نہیں کرتے حالانکہ اس کے قبل تکمیل نہیں ہوتی باقی یہ بات کہ تکمیل کے بعد کیا کرنا چاہیئے تو یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کی نسبت میں نے کہا ہے کہ پھر کبھی کسی کو منقطع نہ کرنا چاہیئے (۲) پس ایک سعی ہے قبل تکمیل (۳) اس کا بیان مقصود تھا اور ایک سعی ہے بعد التکمیل (۴) اس کا بیان آخر میں آگیا تھا اول کی ایسی مثال ہے جیسے کہا جاوے کہ تکمیل کے قبل تعمیر کو نہ چھوڑنا چاہیئے دوسرے کی ایسی مثال ہے جیسے کہا جاوے کہ تعمیر کے بعد انتفاع کو قطع نہ کرنا چاہیئے پس جس طرح مکان کی تعمیر کی تو انتہا ہے اور سکونت کی انتہا نہیں چنانچہ کوئی یہ نہیں چاہتا کہ سکونت کے لئے بھی کوئی

(۱) دین کی انتہاء کیا ہے (۲) چھوڑنا نہیں چاہیئے (۳) ایک کوشش تکمیل سے پہلے ہے (۴) اور ایک تکمیل کے بعد۔

مدت محدود ہو اور تعمیر کو ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کی مدت محدود ہو اور جلد اس بکھیڑے سے نجات ملے اور سکونت کا لطف حاصل کرنے کا موقع ملے بلکہ تعمیر کے مجاہدے میں جو حظ آتا ہے وہ اس حظ کی امید میں آتا ہے جو سکونت سے حاصل ہونے والا ہے اسی طرح دین کو سمجھ لیجئے کہ اس کے استعداد کے لئے مجاہدہ کرنا پڑتا ہے اور اس کی مدت محدود ہوسکتی ہے اور جب دین حاصل ہوجاوے اور اعمال میں لطف آنے لگے تو اس کے لئے کوئی حد نہیں ہوسکتی بلکہ اسمیں دن رات ترقی ہوتی ہے جس کو اس لطف کا پتہ چل گیا وہ خود چھوڑ نہیں سکتا اور جنہوں نے اعمال کو چھوڑا ان کو اس کا احساس ہی نہ ہوا تھا ان کو صرف اسی حظ کا پتہ چلا تھا جو مجاہدہ میں تھا پہلے حظ تھا ترقی میں اور اب ترقی ہوتی ہے حظ میں تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ترقی چھوڑنے کی چیز ہے۔

عامل کو دین سے کبھی سیری نہیں ہوتی

ظاہر بات ہے کہ جب محبوب تک پہنچنے کے لئے محنت کی ہے تو بعد وصول زیادتی حظ کی طرف توجہ کیوں نہ ہو جو عاشق محبوب تک پہنچ جاوے اگر پچاس سال بھی اس کے پاس گذر جاویں تب بھی وہ بس نہیں کرتا کہ اب تو بہت دن لطف اٹھالیا اب ختم کردینا چاہیئے بس جیسے عاشق کو معشوق سے تمام عمر سیری نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کی طلب بڑھ جاتی ہے اور جوں جوں اس کا قرب بڑھتا جاتا ہے اس کی حالت یہی ہوتی جاتی ہے ؎

دل آرام در بردل آرام جوی چو مستسقی تشنہ برطرف جوی(۱)

باقی دنیا کے محبوبوں کے قرب کی تو گاہے اس لئے حد ہوجاتی ہے کہ وہ

(۱) ''محبوب پاس ہے اور پھر اس کو ڈھونڈ رہے ہیں جیسے پیاسا پانی تلاش کرتا پھرتا ہے''۔

خود محدود ہیں اور محبوب حقیقی خود غیر محدود اور لا متناہی ہیں لہذا وہ ان کے قرب کی حد نہیں ہوسکتی اسی کو کہا ہے ؎

اے برادر بے نہایت در گہیست ہرچہ بروے میرسی بروے مالیست (۱)

بلکہ اس راہ میں علاوہ طویل ہونے کے یہ بھی خاصیت ہے کہ اس میں نمو ہوتا ہے اور بڑھتا جاتا ہے ؎

نگردد قطع ہرگز جادہ عشق از دوید نہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از برید نہا (۲)

اس مضمون کی تقریر بہت ہی واضح طریق سے ہوگئی۔

سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کے معنی

اب سنئے کہ ان دونوں مرتبوں کے لئے صوفیاء کی اصطلاح میں دو لفظ ہیں ان کو اگر میں پہلے بول دیتا تو ایک عجوبہ سا معلوم ہوتا اور لوگ ان کو بہت ہی دقیق اور جانے کیا سمجھتے لیکن اول ان کی حقیقت بالکل صاف کردی گئی اب ان لفظوں کو سن لیجئے جس سے معلوم ہوگا کہ وہ کچھ اجنبی اصطلاحیں نہیں ہیں اور سیدھے سیدھے لفظ ہیں صوفیاء کی اصطلاح میں مجاہدہ کی انتہا کا نام سیر الی اللہ ہے اور مشاہدہ کے لفظ کی سیر کا نام سیر فی اللہ ہے یہ دونوں بہت ہی موٹی باتیں ہیں اور ان کی نظیریں ہماری عادات ومحاورات میں موجود ہیں مثلاً جب تک کہ طالب علم نے درسیات ختم نہیں کی ہیں تو اس کے مطالعہ کو سیر الی الکتب کہہ سکتے ہیں اور جب ختم

(۱) ''بھائی اس کی درگاہ بہت ہی بڑی ہے۔ جس منزل پر تیری رسائی ہوجائے اس پر قناعت کر'' (۲) ''راہ عشق دوڑنے سے ہرگز قطع نہیں ہوتا بلکہ ناگ کی طرح قطع کرنے سے اور زیادہ بڑھتا ہے''۔

کر چکے اور پھر مطالعہ کرے (حظ اٹھانے کے لئے اور بصیرت بڑھانے کے لئے) کیونکہ علم ایک عجیب لذیذ جیز ہے تو اس مطالعہ کو سیر فی الکتب کہیں گے یا مثلاً کسی نے دہلی کا ارادہ کیا اور چل دیا تو اس قطع مسافت کو سیر الی دہلی کہیں گے اور جب دہلی پہنچ گیا اور وہاں کی سیر تماشا کرنے لگا تو اس کو سیر فی دہلی کہیں گے یہ کس قدر موٹی باتیں ہیں۔ انہیں لفظوں کو جاہل فقیر عوام کے سامنے بولتے ہیں۔ اور معنوں میں ایچ پیچ دے کر تصوف کو ہاؤ بنا دیتے ہیں (۱) مگر دیکھ لیجئے کس قدر کھلے ہوئے اور بے غبار دقائق ہیں واقعی تصوف ایسی سہل اور مانوس چیز ہے کہ ہر مذاق میں فطرۃً موجود ہے مگر خدا بھلا کرے جاہل مشائخ کا کہ اس کو ایسا مہیب لباس پہنایا ہے (۲) کہ دور سے ڈر معلوم ہوتا ہے غرض سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ کے معنی اچھی طرح سمجھ میں آ گئے ہونگے سیر الی دہلی اور سیر فی دہلی اس کی بہت واضح اور منطبق مثال ہے بس اتنا فرق ہے کہ دہلی محدود ہے تو اس کی سیر بھی محدود ہوگی اور ذات خداوندی غیر محدود ہے تو سیر فی اللہ بھی محدود نہیں ہوسکتی ۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

اے برتر از خیال و قیاس وگمان ووہم واز آنچہ گفتہ ایم واز آنچہ شنیدہ ایم (۳)

اور کہا ہے ۔

مجلس تمام گشت و بپایاں رسید عمر ماہمچناں دراول وصف تو ماندہ ایم (۴)

ابتداء کی باتوں میں اور وہاں کی باتوں میں اتنا فرق ہے کہ یہاں ہر چیز کے لئے ختم ہے اور وہاں ختم نہیں بس اس فرق کو ذہن میں ملحوظ رکھ کر مثال سے

(۱) تصوف کو ایک ہوّا بنا کر پیش کرتے ہیں (۲) ایسا ڈراؤنا لباس پہنایا ہے (۳) ''نہ انکے حسن کی کوئی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کی جیسے جلندھر کا مریض پیاسا مرجاتا ہے اور دریا باقی رہ جاتا ہے اے خیال اور قیاس اور گمان اور وہم ارفع اور اعلیٰ جو کچھ کہ کہا ہے اور سنا ہے اور پڑھا ہے'' (۴) ''عمر تمام ختم ہوگئی بڑھاپا آ گیا، ہم جیسے پہلے دن تھے آج تک ویسے ہی ہیں''۔

بخوبی معنی سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ سمجھ میں آسکتے ہیں غرض ان نظائر سے سیر الی الشئ اور سیر فی الشئ کی حقیقت معلوم ہوگئی اتنا اور یاد رکھئے کہ متناہی میں سیر ختم ہوسکتی ہے اور غیر متناہی میں ختم نہیں ہوسکتی اسی کو کہا ہے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز وکاغذ سوز و دم درکش
کہ حسن ایں قصۂ عشق است دردفتر نمی گنجد (۱)

وجہ یہ کہ عشق حقیقی کو تعلق غیر متناہی کے ساتھ ہے اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ ''ایں قصۂ عشق است دردفتر نمی گنجد''۔

تعیینِ بیان

اس وقت میں سیر فی اللہ کو نہیں بیان کروں گا کیونکہ اس کی تو کوئی انتہا نہیں بلکہ سیر الی اللہ کو بیان کرتا ہوں کیونکہ یہ سیر محدود ہے اور اُسی کے لئے اخیر ہوسکتا ہے اور مجھے آخر الاعمال کا بیان کرنا ہے بلفظ دیگر اس طرح سمجھئے کہ سیر الی اللہ کہتے ہیں مجاہدہ کو میں اس کی انتہا کو بیان کرتا ہوں تا کہ اندازہ ہوسکے کہ میری شکایت کہاں تک صحیح ہے اور دنیا کے کسی کام میں انتہا سے قبل قناعت نہیں ہوتی اور دین میں قناعت ہوجاتی ہے یہ شکایت جب ہی ہوسکتی اور اسکا رفع کرنا بھی جب ہی ممکن ہے کہ اس انتہا کا علم ہو اس واسطے ضرورت انتہا کے بیان کی ہے جو آیت اس وقت پڑھی گئی ہے اس میں انتہائی مرتبہ کا بیان ہے پس میں اول آیت کا ترجمہ بیان کروں گا نفس مطلب اُسی سے نکل آوے گا پھر بقدر مناسب اس کی توضیح کروں گا۔

(۱) ''قلم ٹوٹ جائے سیاہی خشک ہوجائے کاغذ ناپید ہوجائے دل کی دل ہی میں رہ جائے کہ یہ قصۂ حسن و عشق دفتروں میں بھی نہیں سماسکتا''۔

اللہ کی مہربانی

فرماتے ہیں: ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ یعنی لوگ مختلف ہیں جن میں سے اوپر کئی قسم کا بیان ہو چکا انہی میں سے ایک قسم یہ ہے کہ بعضے بیچ ڈالتے ہیں اپنے آپ کو حق تعالیٰ کی مرضی کی تلاش میں، بیع ایک امر ہے جس کا تعلق بدلین سے ہوتا ہے جب ایک طرف سے اپنے نفس کو دے ڈالنا ہوا تو دوسری طرف سے بھی عوض ہوگا جس کا بیان اس جملہ میں موجود ہے: ﴿وَاللّٰهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ﴾ یعنی حق تعالیٰ بڑے مہربان ہیں بجائے بیان اور تصریح عوض کے یہ مضمون لایا گیا جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ عوض ہوگا جو حق تعالیٰ کا شان رافت کے مناسب ہوگا رافت کا ترجمہ ہے شدت رحمت حق تعالیٰ کی رحمت اگر خفیف سی بھی ہو تو بہت ہے چہ جائیکہ شدید ہو، اور الف لام ''اَلْعِبَاد'' میں یا تو عہدی ہے معنی یہ ہونگے کہ حق تعالیٰ ایسے بندوں کے ساتھ شدت رحمت کا برتاؤ کرنے والے ہیں اور اگر جنس کا بھی لیں تب بھی ظاہر ہے کہ معنی یہی ہیں کیونکہ ترجمہ یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ عام طور سے بندوں کے ساتھ مہربان ہیں اس سے التزاماً نکلتا ہے کہ ایسے خاص بندوں کے ساتھ تو بطریق اولیٰ رافت کا برتاؤ کریں گے معلوم ہوا کہ ادھر سے عوض میں وہ چیز عطا ہوگی جس سے اس بدل کو کچھ مناسبت ہی نہیں پھر تخصیص نہیں کسی عوض کی نہ معلوم کیا عطا ہوگا بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عدم تصریح کی وجہ یہ ہے کہ وہ عوض سمجھ میں آنے کی چیز نہیں اس کا بیان کیا کیا جاوے پس بدلے میں کچھ مشابہت اور مناسبت ہی نہیں ہوگی۔

اللہ کی مہربانی کا مقتضاء

اس کی نسبت کہا ہے ؎

جمادے چند دادم جاں خریدم بنام ایزد عجب ارزاں خریدم(۱)

اور کہا ہے

ع متاع جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے

یہ جان اس کے سامنے واقعی ایک ٹھیکرا ہے اور وہ مضمون بالکل صحیح ہے

جمادے چند دادم جاں خریدم بنام ایزد عجب ارزاں خریدم

خود کہ باید ایں چنیں بازار را کہ بیک گل می حری گلزار را(۲)

اور ؎

نیم جاں بستاند صد جاں دہد آنکہ دروہمت نیاید آں دہد (۳)

جب یہ عطا ہیں تو کیا بندے کی طرف سے تسلیم نفس میں کچھ تامل چاہیئے؟ اللہ تعالیٰ کے سامنے تو کیا تامل ہوتا اللہ والوں کی سامنے تسلیم کرانے کی نسبت فرماتے ہیں ؎

ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ شاد وخنداں پیش تیغش جاں بدہ(۴)

---

(۱) ''میں نے چند پیسوں میں جان خریدی ہے، خدا کی قسم بڑی سستی خریدی ہے'' (۲) ''ایسا بازار کہاں مل سکتا ہے کہ ایک پھول کے بدلہ میں چمن ہی خریدتے'' (۳) ''فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلے باقی جان عطا کرتے ہیں جو وہم وگمان میں بھی نہیں آتا'' (۴) ''حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح اس کے سامنے گردن جھکادے، ہنستے کھیلتے تلوار کے سامنے جان دینے کے لئے تیار ہوجا''۔

اور حق تعالیٰ کو تو ہر چیز پر مالکانہ اور خالقانہ حقوق حاصل ہیں پھر اگر کسی نے جان بھی نذر کردی تو کیا احسان ہوا جان انہیں کی تو تھی ۔

آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست(۱)

دیکھا جاتا ہے کہ دنیا کے ایک محبوب یا حاکم کے سامنے جان کی اور آبرو کی کچھ حقیقت نہیں سمجھی جاتی مطیع وہی سمجھا جاتا ہے جو حکم کے سامنے کسی چیز کی بھی پرواہ نہ کرے ۔ سپاہی بادشاہ کے حکم پر گلے کٹواتے ہیں ایک بازارن عورت کے عشق میں لوگ ننگ وناموس کو بھول جاتے ہیں جان اور مال اور آبرو سب فدا کردیتے ہیں پھر اگر کسی نے محبوب حقیقی کے سامنے ان چیزوں کو ذخیرہ کرکے رکھا اور فدا نہ کردیا تو وہ کس کام کا آدمی ہے معمولی محبت میں بھی ان کی پرواہ کرنا خلاف مروّت ہے۔

حقیقی دوستی کی مثال

ایک بزرگ کا قول ہے کہ اگر دوست سے قرض مانگو اور وہ پوچھے کتنا تو وہ شخص دوستی کے قابل نہیں دوستی کے قابل وہ ہے کہ اشارہ پاتے ہی کل مال اپنا حاضر کردے پہلے زمانہ کے لوگ بھی کس طرح کے تھے ایسے دوستوں کا وجود اب کہاں ہے ایک شخص کا قصہ ہے کہ اپنے دوست کے مکان پر رات کے وقت گئے اور آواز دی۔ وہ پانچ منٹ کے بعد گھر میں سے نکلے یہ توقف ظاہراً دوستی کے خلاف تھا۔ مگر جس صورت سے گھر سے باہر آئے اس میں دیر لازم تھی اور وہ صورت یہ تھی کہ ہتھیار لگائے ہوئے تیار اور خوبصورت لونڈی زیور سے آراستہ پیراستہ آگے آگے اور اس کے ہاتھ میں شمع اور ایک غلام بھی پیچھے پیچھے جس کے

(۱) جس نے جان دی ہے وہ اگر واپس لے تو اس کو روا ہے۔

کندھے پر کچھ بوجھ تھا، آنے والے نے اس بکھیڑے کی وجہ پوچھی، اس نے کہا اس وقت تمہارے آنے سے مجھے چند احتمال ہوئے ایک یہ کہ شاید کسی حسین کے نہ ہونے سے تنہائی میں دل گھبرایا ہو اس کے واسطے تو یہ لونڈی موجود ہے اور شاید خادم کی ضرورت ہو تو یہ غلام حاضر ہے اور گر کسی دشمن نے پریشان کیا ہو تو میں اپنی جان سے موجود ہوں۔ اور شاید خرچ کی ضرورت ہو تو یہ توڑا اشرفیوں کا تیار ہے۔ کہا مجھ کو کسی چیز کی ضرورت نہیں یہ سب چیزیں آپ کو مبارک رہیں مجھے اس وقت آپ کی صورت یاد آ گئی اور ایسا دل بے چین ہوا کہ بلا دیکھے رہ نہ سکا بس جایئے آرام کیجئے، دونوں اچھے ہی تھے جیسے وہ تھے ایسے ہی وہ تھے، کیا اس کی کوئی نظیر دنیا داروں میں مل سکتی ہے آج کل لوگ رسوم کو باعث ازدیاد محبت کہتے ہیں کیا یہ بات کسی اہل رسم کو نصیب ہو سکتی ہے یا ان لوگوں میں ایسی محبت رسوم سے پیدا ہوئی تھی غرض دوستی کی شرط یہ ہے کہ یوں نہ کہے کیا چاہیئے بلکہ بلا کہے جان و مال سے حاضر ہو جائے جب مجازی دوست کے ساتھ محبت کا یہ مقتضاء ہے تو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا مقتضاء تو ظاہر ہے کہ کیا ہونا چاہیئے۔

اللہ سے محبت کا مقتضاء

خدا تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب سمجھو اور اس سے آبرو کو یا جان کو یا مال کو بچانا روا نہ رکھو اور یہ نہ کرو ؎

گر جان طلبی مضائقہ نیست وگر زر طلبی سخن دریں است(۱)

خدا تعالیٰ کے ساتھ بخل نہ کرو کہ وہ اپنے ساتھ ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کو کسی چیز کی احتیاج نہیں جو کچھ خرچ کراتے ہیں وہ صرف تمہارے نفع کے لئے۔

(۱) ''اگر جان مانگو تو جان حاضر ہے لیکن اگر مال و زر طلب کرو تو یہ سوچنے کی بات ہے''۔

بخیل کا قصہ

خدا تعالیٰ کے ساتھ خلوص اور عشق کا برتاؤ ہونا چاہیئے نہ ایسا کہ کسی بخیل سے دوست نے کچھ مانگا کہا'' محبت رکھیں پاک اور لینے دینے کے منہ میں خاک'' ہماری تمہاری محبت ہے اور لینے دینے کا جھگڑا ہے۔

اور ایک بخیل کا قصہ ہے کہ اس سے ایک دوست نے کہا اپنی نشانی کے واسطے یہ انگوٹھی دے دو کہ جب اُسے دیکھا کریں تو تم یاد آجایا کروگے، کہا اتنے بکھیڑے کی کیا ضرورت ہے یاد کے لئے یہی کافی ہے کہ جب تم اپنی انگلی خالی دیکھو تو میری یاد آجایا کرے گی کہ انگوٹھی مانگی تھی نہیں دی تھی۔ نہ مال کے خرچ کرنے میں خدا تعالیٰ کے سامنے حیلہ ہونا چاہیئے نہ جان کے خرچ کرنے میں خدا تعالیٰ کے سامنے چور بنے۔

نوکر کی بہانہ بازی

جیسے ایک نوکر کا قصہ ہے کہ وہ کام چور بہت تھا جب کام کو کہا جاتا تو کوئی ترکیب ایسی نکالتا کہ کام کرنا نہ پڑے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آقا نے کہا ذرا صحن میں نکل کر دیکھنا بارش تو نہیں ہورہی۔ کہا حضور بارش ہورہی ہے کہا باہر تو نکلا نہیں کیسے معلوم ہوا کہ بارش ہورہی ہے؟ کہا حضور ابھی بلی باہر سے آئی تو وہ بھیگی ہوئی تھی معلوم ہوا کہ بارش ہورہی ہے (بھیگی بلی کا قصہ یہی ہے) پھر آقا صاحب نے کہا چراغ گل کردے، کہا حضور منہ ڈھانک لیں جب آنکھیں ڈھانک لیں گے تو آپ کے سامنے اندھیرا ہوگا۔ کہا اچھا کواڑ تو بند کرلے، کہا میں سارے کاموں کا نوکر تھوڑا ہی ہوں دو کام میں نے کئے ایک کام آپ کرلیجئے۔

ایسے ہی بعض دوست بھی ہوتے ہیں کہ ترکیبیں بتاتے ہیں اور کام کچھ بھی نہیں آتے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا برتاؤ

کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہی برتاؤ کافی ہے کہ وہ کچھ خرچ کرنے کا حکم دیں تو اس بخیل کی طرح کہہ دیا جاوے کہ ہمیں اسی طرح یاد کرلینا کہ فلاں شخص نے بخل کیا اور خرچ نہ کیا حقوق مالیہ کے ادا نہ کرنے کی حقیقت یہی تو ہے۔ اس بخیل کے قصہ کو سن کر تو ہم لوگ ہنستے ہیں اور خود ویسا ہی کرتے بلکہ اتنا فرق ہے کہ اس نے تو یہ جواب ایسے شخص کو دیا جس سے اس کو مساوات حاصل تھی (۱) اور اس کا مال مانگتا تھا اور یہاں حقوق مالیہ کے ادا نہ کرنے میں یہ جواب ایسی ذات کو دیا جاتا ہے جو ہمارا مساوی نہیں ہے۔ ہم بندے ہیں اور وہ خدا ہے اس نسبت کو تو ملاحظہ کیجئے قطع نظر بخل سے، گستاخی کتنی بڑی ہے اگر ایک بہت بڑا بادشاہ ادنی بھنگی سے کوئی چیز مانگے اور وہ اس کو کورا جواب دے دے تو بادشاہ کی کس قدر توہین کی اور یہ کس قدر جسارت ہے پھر جو مال حق تعالیٰ مانگتے ہیں وہ کسی کے باوا کا نہیں ہے خود اُن ہی کا مال ہے اس کو روکنے کا کیا حق ہے، یہ دو باتیں ہمارے برتاؤ میں اس بخیل کے قصے سے زائد ہیں اور اس پر محبت کا دعویٰ کیا ہی برمحل ہے خدا کی محبت میں مال کا خیال، علی ہذا دوسرے حقوق میں خدا کی محبت کا دعویٰ ہے اور آبرو یا جان کا خیال، یہ ہے خرابی جس نے غارت کر رکھا ہے معلوم ہے کہ فلاں رسم بُری ہے مگر کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہے تو شرع کی بات مگر ہم چشموں میں ہیٹی ہوگی (۲) جناب کیسے ہم چشم اور کیسی ہیٹی ۔

نسازد عِشق را کنج سلامت خوشا رسوائی کوئے ملامت (۳)

(۱) برابری کا درجہ حاصل تھا کہ وہ بھی انسان اور یہ بھی انسان (۲) اپنی بھائی برادری میں شرمندگی ہوگی
(۳) یعنی عشق کو گوشۂ سلامتی موافق نہیں اس کے مناسب تو کوچۂ رسوائی ہے۔

عاشق کا حال

کہیں عاشق کو ملامت کا اثر ہوسکتا ہے بلکہ اس کو تو ملامت میں مزا آتا ہے اور ملامت سے خوف ہونا تو دلیل اس بات کی ہے کہ عشق کی ہوا بھی نہیں لگی اس واسطے کہا ہے ؎

در رہِ منزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی (۱)

جب مجنوں و عاشق ہوگئے تو کوئی بھی خطرہ باقی نہیں تھا۔ خود عاشق پر تو کیا اثر ہوا کہ وہ دوسروں جیسا ہوجاوے وہ تو دوسروں کو بھی اپنا ہی سا بنانا چاہتا ہے چنانچہ دوسروں کو مشورہ دینے کے لئے کہتے ہیں ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگذارند وخمِ طرۂ یارے گیرند (۲)

سب مصلحت اور انجام بینی رکھی رہ جاتی ہے جس وقت عشق کی ذرا سی بھی ہوا لگ جاتی ہے اور آدمی آبرو اور جان اور مال سب محبوب کے سامنے رکھ دیتا ہے اور اگر وہ ان سب کو قبول کرلے تو یہ احسان مند ہوتا ہے، عشق کی ہوا ہی نہیں لگی ہے جو مصلحت اور پالیسی لئے پھرتے ہیں مصلحت اور پالیسی کی ضرورت وہیں ہوتی ہے جہاں دو مختلف طرف کے تعلق کو نباہنا پڑتا ہے کہ اس کو بھی راضی رکھتا ہے اور اس کو بھی لہذا کچھ اِدھر کی بات ہو اور کچھ اُدھر کی بس ایک کو لو اور سب کو ترک کردو اور اس کے سامنے کسی کی پرواہ نہ کرو۔ عاشق کو کیا پرواہ ہونی چاہیئے عاشق کا مذہب تو یہ ہوتا ہے ؎

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں مانمی خواہیم ننگ ونام را (۳)

معمولی عشقوں میں یہی ہوتا ہے اور خدا کا نام لینے والے کے نزدیک تو

---

(۱) ''راہ لیلیٰ میں خطرات بہت ہیں اس کے قطع کرنے کے لئے مجنوں ہونا پہلی شرط ہے'' (۲) ''مصلحت یہ ہے کہ سارے جہاں کی مصلحت کو چھوڑ کر دوست محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہوجائیں'' (۳) ''اگرچہ عقلاء کے نزدیک بدنامی کی بات ہے، لیکن ہم ننگ وناموس کے خواہاں نہیں ہیں''۔

دنیا و مافیہا بھی کچھ نہیں کیسا ننگ اور کیسا نام واللہ سب ہوا ہوجاتے ہیں مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

اے دوائے نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون وجالینوس ما(۱)

نخوت و ناموس کی تو یہ محبت پھونک دینے والی ہے ان کا تو نام ہی نہیں رہتا قیامت تک یہ مصلحت اندیشی عشق میں نہیں ہوسکتی کہ ہٹی ہوگی۔ عاشق کی تو نظر ایک ہی پر پڑتی ہے دوسرا کوئی نظر میں ہوتا ہی نہیں جس کے سامنے ہٹی ہوگی۔

ہماری مِلک کی حقیقت

غرض جب خدا کا نام لیا تو اسی کے ہورہو اور اس سے کوئی چیز ذخیرہ نہ کرو جان و مال آبرو سب اس پر فدا کردو کیا غضب ہے کہ حق تعالیٰ سے معاہدہ تو کیا گیا ہے اس طرح کہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ (۲) یعنی حق تعالیٰ سے ہم نے جنت کا سودا کیا ہے اور ہم نے داموں میں دیا ہے اپنی جانوں کو اور مالوں کو اور جنت کے خریدار بنے ہیں مگر یہ اچھی خریداری ہے کہ چیز لے لی اور دام ندارد (۳) جنت وغیرہ سب لینے کے لئے ہر وقت ایسے تیار بیٹھے ہیں کہ اگر آواز دی جاوے کہ چلو جنت کس کس نے خریدنی ہے تو سب سے پہلے ہم ہی بول اٹھیں گے کہ ہم ہیں ہم اور جو کوئی پوچھے کہ دام بھی دیئے ہیں تو جواب ندارد ہوگا ذرا انصاف کیجئے اور پھر حق تعالیٰ نے خریدا بھی کیا ہے خود اپنی ہی چیز کیونکہ وہ تمہاری چیز کونسی ہے جس کا تم عوض دیتے ہو وہ سب چیزیں تو ان ہی

(۱) ''اے ہمارے ننگ و ناموس کے طبیب، اے ہمارے افلاطون اور جالینوس'' (۲) ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی'' سورۂ توبہ: ۱۱۲ (۳) چیز لے لی اور پیسے دیئے نہیں۔

کی ہیں صرف فرضی بیع ہے اور دل خوش کرنے کو بیع کا نام لگادیا ہے جو چیز ہماری کہی جاتی ہے اس کی حقیقت یہ ہے جیسے کسی نے چار پائیاں بنائیں اور اپنی ہی مِلک میں رکھ کر کہہ دیا کہ یہ ننھے کی اور دوسری منے کی (یعنی دوسرے بچے کی) کیا یہ واقع میں ان ہی کی ہیں۔ ان کے تو باوا کی ہیں بس دنیا کا مال ومتاع اسی طرح سے ہمارا کردیا گیا ہے کہ نام لگادیا گیا ہے ہمارا ان پر، جیسے بچوں سے کہہ دیا یہ ننھے کی اور یہ دوسری منے کی، اللہ میاں نے اپنی چیزوں میں سے بعض پر ہمارا نام لگادیا پھر کہا یہ چیز بیچتے ہو۔

اللہ کے ساتھ بیع وشراء کی حقیقت

دونوں اب بھی ہیں ان ہی میں غور سے دیکھئے تو مطلب کیا ہے کہ وہ چیزیں تو دی ہی نہیں دوسری چیز اس بہانہ سے اور دے دی کیونکہ ان کو یہ چیزیں لینا تھوڑا ہی ہے ان کو جان و مال کا اچار ڈالنا تھوڑا ہی ہے اور انہیں کے جان و مال کے مانگنے کے یہ معنی بھی نہیں کہ خودکشی چاہتے ہوں یا مال سے الگ کرتے ہوں کہ بالکل محتاج ہوکر بیٹھ جاؤ بلکہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ کچھ حدود ہیں ان کے اندر رہے اور مخلّٰی بالطبع ہوکر جو دل میں آوے مت کر گذرو(۱) آرام ولذّات کو ان کو دے ددو پھر یہ بھی تم ہی کو دے دینگے جیسے بعض کریم النفس نیوتہ میں ایک روپیہ لیتے ہیں تو خود دو روپیہ دیتے ہیں ایسوں کے سامنے ایک روپیہ پیش کرنے میں بخل کرنا اپنا ہی نقصان کرنا ہے دیتے وقت تو ایک روپیہ گرہ سے جاتا ہی ہے اور کوئی کوتاہ نظر لالچ میں آکر ہاتھ روک لے تو تعجب ہے مگر جس کو اس کے کرم کی حالت معلوم ہے اور اس کے انجام کو جانتا ہے وہ ایک روپیہ دینے میں ہرگز تامل نہ کرے گا بلکہ غنیمت سمجھے گا اور خوش ہوگا کہ یہ روپیہ اپنے ساتھ ایک کو اور لاوے گا یہی معاملہ حق تعالیٰ کا ہے کہ اس وقت جان ومال

(۱) بغیر سوچے سمجھے جو دل میں آئے نہ کر گذرو۔

کے یعنی لذّات کے مشتری بنتے ہیں مگر جتنا لیں گے اُس سے دو چند نہیں بلکہ ''اَضْعَافًا مُّضَاعَفَه'' اور ہزاروں گنا زیادہ دیں گے محبت میں ظاہراً مرجاتا ہے مگر ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد آنکہ در وہمت نیایدآں دہد(۱)

غرض یہ بیع بھی فرض ہے اور درحقیقت عطا ہی عطا ہے۔ بہرحال فرماتے ہیں آیت میں کہ بعض لوگ وہ ہیں جو بیچتے ہیں اپنی جان کو ابتغاء مرضاۃ اللہ کے لئے اور اس کے دام اُدھر سے کیا ہیں: ﴿وَاللّٰہُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ﴾ یعنی حق تعالیٰ بندوں کے ساتھ بہت ہی مہربان ہیں۔

حصولِ علم میں ترتیب

ترجمہ آپ نے سن لیا اب میں بتاتا ہوں کہ وہ انتہائی مرتبہ کیا ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے اس کو میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا پس جان لیجئے کہ فن سلوک جس کا یہ مسئلہ ہے اس کے ماہرین اور محققین نے اکثر مقامات یعنی اعمال باطنہ میں ترتیب کا حکم کیا ہے اور ان مقامات کی مثال درسیات کے سبق کی سی ہے کوئی سبق تو ایسا ہے کہ اس میں اور دوسرے اسباق میں ترتیب ضروری ہے جیسے الف بے اور سپارہ کہ یہ ممکن نہیں کہ الف بے کو سپارہ پر مقدم نہ کیا جاوے اور بعضے سبق ایسے ہیں کہ کئی کئی ہوسکتے ہیں جیسے کافیہ اور قطبی لوگ اس فن سے چونکہ بالکل نا آشنا ہوگئے ہیں اس واسطے قاعدہ اور طریقہ جانتے نہیں جو چال سمجھ میں آجاتی ہے اختیار کرلیتے ہیں اور مدتوں پریشان رہتے ہیں اور حاصل کچھ بھی نہیں جیسے کوئی یہ نہ جانتا ہو کہ الف بے اور سپارہ میں ترتیب ضروری ہے اور وہ بلا الف بے پڑھے سپارہ شروع کردے اور ایک

(۱) ''یعنی جس کو عشق حقیقی سے روحانی زندگی حاصل ہوگئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقع میں اس کو زندہ ہی کہنا چاہیئے، فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلے باقی جان عطا کرتے ہیں جو وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا عنایت کرتے ہیں''۔

حصہ عمر کا گذار دے مگر سپارہ میں کما حقہ کامیاب نہ ہوگا بخلاف اس کے ایک شخص ترتیب سے پڑھے تو اس نہ اتنی محنت کرنی پڑے گی اور نہ اتنا وقت صرف ہوگا اور کامیاب بھی ہوجاوے گا اول شخص کے نزدیک سپارہ اسقدر مشکل چیز ہے کہ اس کے پڑھنے میں وقت بھی بہت زیادہ صرف ہوگیا اور دماغ بھی خالی ہوگیا اور دوسرے کے نزدیک کچھ بھی نہیں آرام سے پڑھا اور وقت زیادہ نہیں لگا اور کامیابی بھی خاطر خواہ ہوئی یہ طریقہ اچھا ہے یا وہ، تصوف کے مشکل ہونے کی یہی اصل ہے ورنہ فی نفسہ بہت ہی سہل ہے۔

علم تصوف کے حصول کا طریقہ

اگر شوق ہے تو اس کا طریقہ سیکھئے ہر کام طریقہ ہی سے ٹھیک ہوتا ہے اور بے طریقہ چلنے سے سوائے حیرانی کے کچھ نہیں ہوتا اور وہ طریقہ شیوخ محققین جانتے ہیں پس اس کا اتباع گویا عین طریق ہے ۔

گر ہوائے ایں سفر داری دلا دامن رہبر بگیر وپس پیا
در ارادت باش صادق اے فرید تابیانی گنج عرفاں را کلید(۱)

اور ۔

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق عمر بگذشت و نہ شد آگاہِ عشق(۲)

بس کسی کے ساتھ ہو جاؤ اور اپنے کو اس کے سپرد کردو

پیر خود را حاکم مطلق شناس تابراہ فقر گردی حق شناس
چوں گزیدی پیرہن تسلیم شو ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو
صبر کن در راہ خضر اے بے نفاق تانگوید خضر روہذا فراق(۳)

(۱) ”اے دل اگر راہِ طریقت میں تو چلنا چاہتا ہے تو کسی شیخ کامل کا دامن پکڑ اور خودی کو چھوڑ دے، اپنے راہِ طریقت کے تلاش میں سچا اور ثابت قدم رہ تا کہ اس خزانہ کی چابیاں تجھ کو مل جائیں یعنی تو کامیاب ہوجائے“ (۲) ”بغیر رہبر اور مرشد کے جس نے اس راہ میں قدم رکھا وہ ساری عمر اسی میں گم ہو کر رہ گیا اور کامیاب نہ ہو“ (۳) ”اپنے پیر کو اپنا پورا حاکم مانو تا کہ فقر کے راستہ سے اللہ تعالیٰ کو پہچان سکو، جب پیر چن لیا تو پھر اس کا کہنا مانو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی طرح حضرت خضر (علیہ السلام) کے ساتھ چلو، اے سچے آدمی خضر کی راہ میں صبر سے کام لے تا کہ خضر یہ نہ کہہ دیں کہ بس اب مجھ سے جدا ہوجا“۔

انتخاب پیر میں احتیاط

مگر پیر کو پہلے دیکھ لو ہر شخص کے ساتھ نہ ہو جاؤ اس فرقے میں راہزن بہت ہیں پیر کامل ہو متبع سنت ہو متبع شیطان نہ ہو کامل و مکمل ہو اور جامع ہو ظاہر و باطن کا نہ ظاہر اس کا خلاف شرع ہو نہ باطن خوب پرکھ لو۔ اس میں جلدی نہ کرو اس میں جتنی دیر لگے گی اتنا ہی نفع زیادہ ہوگا جب ایسا پیر مل جاوے تو ہمہ تن اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دو اور وہ جو کچھ بتلاوے اُسی کو صحیح سمجھ لو کچھ اس میں شک و شبہ نہ کرو اس کے حکم کو خدائے تعالیٰ کا حکم سمجھو اور یہ پیر پرستی نہیں۔ وہ خدا نہیں ہے بلکہ یہ اس واسطے کہا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ بتاتا ہے وہ خدا اور رسول اللہ ﷺ ہی کا حکم ہوتا ہے اور سب قرآن و حدیث کے موافق ہوتا ہے۔

قرآن و حدیث میں علوم تصوف

قرآن و حدیث میں تصوف بھرا پڑا ہے اور ایک ایک مسئلہ تصوف کا قرآن و حدیث سے ثابت ہے یہ ہماری سمجھ کا قصور ہے کہ ہم نے نہیں سمجھا مثلاً دیکھئے کہ یہی مسئلہ انتہائی مرتبہ کا ہے اس آیت میں موجود ہے جس کا اس وقت بیان شروع کیا گیا ہے مگر ہمیشہ پڑھا اس آیت کو اور کبھی سمجھ میں نہ آیا جب تک کہ ان لوگوں نے نہ بتایا۔ یہ سب علوم قرآن و حدیث میں موجود ہیں مگر مقفل ہیں اور کنجی ان کی حضرات اہل اللہ کے پاس ہے ذرا سی معمولی بات تک بھی رسائی بلا ان کی عنایت کے نہیں ہو سکتی اور ان کی عنایت کے بعد بڑی بڑی باتیں بھی معمولی نظر آتی ہیں اور ہر جزو میں تصوف نظر آتا ہے اب تو یہ حالت ہے ۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من از رفتار پائت می شناسم(۱)

بلکہ اس سے اور ترقی کی جاتی ہے اور یوں کہا جاتا ہے۔

ع من اندازِ قدت را می شناسم(۲)

اب تو ہر آیت وحدیث میں نظر آتا ہے کہ یہاں فلانی بات تصوف کی ہے اور یہاں فلانی ہے اور یہ سب احسان انہیں حضرات کا ہے میرا اسمیں کچھ کمال نہیں میں اس موقع پر بھی انہیں کے اقوال نقل کرتا ہوں پس اس میں اختلاف ہے کہ انتہائی مرتبہ مقامات سلوک کا کیا ہے۔ جب سلوک میں مقامات ہیں اور مجھے بیان کرنا اُسی کا انتہائی مقام ہے تو اول ضرورت ہے کہ لفظ مقام ہی کے معنی بیان کئے جاویں کیونکہ یہیں سے غلطیاں شروع ہوتی ہیں۔

خود ساختہ تصوف

آج کل تصوف میں اول سے آخر تک ایسا خبط کیا گیا ہے کہ مجموعہ اعاجیب اور تکلیف مالایطاق کا نام تصوف ہوگیا ہے(۳) اسی واسطے اس کے نام سے لوگ ڈرتے ہیں اور اسی واسطے اس کو شریعت سے الگ کیا جاتا ہے کیونکہ شریعت کا تو عام اور پہلا اصول یہ ہے: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾(۴) اور ان کے مخترع تصوف کا پہلا قدم مالایطاق ہے (۵) پھر دونوں موافق کیسے ہوں۔ چنانچہ بہتوں کا گمان حقیقت تصوف کی نسبت یہ ہے کہ عورت کو ترک کرو اور مکان اور جائیداد بھی علیحدہ کرو تب سلوک میں قدم رکھو لوگوں نے تصوف کو ہوّا بنایا ہے(۶) جس سے دور ہی سے ڈر معلوم ہو، اس واسطے جس کو دیکھیں کہ یہ عورت بھی

(۱) ''کسی بھی بھیس میں آؤ میں رفتار قدم سے پہچان لیتا ہوں'' (۲) ''میں تیرے قد کے انداز کو پہچانتا ہوں'' (۳) عجیب وغریب باتوں اور ناقابل برداشت تکالیف کا نام تصوف رکھ لیا (۴) اللہ تعالیٰ (احکام شرعیہ میں) کسی شخص کو مکلف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو (۵) خود ساختہ تصوف کا پہلا ہی قدم ایسا ہے کہ جس کی آدمی طاقت نہیں رکھتا (۶) ڈراؤنی بلا بنادیا۔

رکھتے ہیں (۱) رہنے کا مکان بھی ان کے پاس ہے اس کو صوفی نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ یہ تو دنیا دار ہیں ایسے شخص کو پیر بنانا تو دور رہا ادنیٰ درجہ میں بھی شمار نہیں کرتے حالانکہ کوئی صوفی محقق مطیع سنت کبھی ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ شریعت ان کے خلاف کے ساتھ وارد ہے چنانچہ تبتّل (۲) کو شریعت نے منع کیا ہے اور مکان کی بھی اجازت دی ہے چنانچہ سلف نے مکان رکھے ہیں۔ مکان تو مکان گاؤں خریدنے کو بھی اور ایک گاؤں نہیں دو دو گاؤں خریدنے اور عورت ایک نہیں چار تک رکھنے کو بھی محقق منع نہ کرے گا نہ کسی صوفی نے آج تک منع کیا اور کسی کا حال کے غلبہ میں خود چھوڑ دینا اور بات ہے ایسے بہت سے طالبان خدا نے کیا ہے اور بڑے بڑے مجاہدے ان سے منقول ہیں سلطنتیں چھوڑ دی ہیں بعضے خشک مزاجوں کو غلبہ کے اس اثر میں بھی کلام ہے۔

طالبانِ خدا کی مثال

مگر غلبہ ایسی چیز ہے کہ جب تک کسی کو پیش نہیں آتا ہے تب تک جو چاہے باتیں بنالے اور حجت اور دلیل کا مطالبہ کرلے اور جب پیش آجاوے تو کوئی چیز بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تم کو غلبہ ہوگا تو تم بھی چھوڑ دوگے اور قیل وقال سب بھول جاؤ گے غلبہ اور عدم غلبہ مثال ایسی ہے جیسے پلاؤ اور خشکہ (۳) ایک شخص خشکہ کھا رہا ہے اور شوق سے کھا رہا ہے اور بعض اور لوگوں کو دیکھتا ہے کہ وہ پلاؤ کھاتے ہیں خشکہ کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تو تعجب کرتا ہے اور اعتراض کرتا ہے کہ یہ اتنی لذیذ چیز کو چھوڑے بیٹھے ہیں۔

اس کا جواب یہی ہوسکتا ہے کہ اس کے سامنے بھی پلاؤ کی ایک رکابی رکھدی جاوے

(۱) بیوی ہے (۲) مجرد رہنے کو (۳) گوشت کے ساتھ پکے ہوئے چاول اور سادے چاول۔

اور اس کو ایک لقمہ پلاؤ کا چکھا دیا جاوے وہ چکھتے ہی پھر نام خشکے کا نہ لے گا حالانکہ کسی نے اس کو خشکہ سے منع نہیں کیا اس وقت اس سے پوچھنا چاہیئے کہ خشکہ جیسی لذیذ چیز کو کیوں چھوڑا۔ جواب یہی ملے گا کہ میاں بیٹھو اس کے سامنے خشکہ کیا چیز ہے ایک لقمہ تم بھی کھا کر دیکھو تم بھی یہی کہنے لگو گے۔ یہی حال خدا کے راستہ کا ہے کہ آدمی دور سے جو چاہے کہہ لے اور طالبانِ خدا پر اعتراض کرلے مگر ذرا ادھر کو رُخ کر کے پھر دیکھیں وہ اعتراض کدھر جاتے ہیں اور دنیا اس کو کیسے یاد رہتی ہے ؎

تابدانی ہر کہ را یزداں بخواند از ہمہ کار جہاں بیکار ماند (۱)

اس وقت یہ حالت ہوگی کہ دنیا سے منع نہ کرنا تو درکنار اگر امر بھی کیا جاویگا دنیا کی طلب کا تو اس سے ہو نہ سکے گا۔

عشقِ حقیقی کا حال

بہت موٹی سی مثال اس کی یہ ہے کہ ایک طوائف سے کسی کا دل لگ گیا ہو تو وہ اُسی کا ہو رہتا ہے اور بی بی کو بھول جاتا ہے حتی کہ اگر وہ طوائف اب اس کو اجازت بھی دے کہ بی بی کے پاس جاؤ بلکہ اس کا امر بھی (۲) کرے تب بھی وہ نہ کر سکے گا محبت میں تو خاصیت ہی یہ ہے کہ اور کچھ رہتا ہی نہیں جب ایک بازاری عورت کے عشق میں یہ خاصیت ہے تو ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے گشتن بہر وے اولیٰ بود (۳)

اور شیخ فرماتے ہیں ؎

(۱) ”جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنا لیتے ہیں اس کو تمام دنیا کے کاموں سے بیکار کر دیتے ہیں“ (۲) حکم بھی دے (۳) حق تعالیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کہیں کم ہو سکتا ہے عشق خداوندی میں گیند کی طرح لڑھکنا زیادہ اچھا ہے یعنی رضائے حق میں مثل گیند کے ہو جائے کہ جدہر خدا کا حکم ہو ادھر ہی پھر جائے۔

ترا عشق ہمچو خودے زآب و گل ربایدہمہ صبرو آرام ودل (۱)

اور مال و دولت کا یہ حال ہوتا ہے ۔

چو درچشم شاہد نیاید زرت زروخاک یکساں نماید برت (۲)

آگے فرماتے ہیں ۔

عجب داری از سالکان طریق کہ باشند در بہر معنے غریق (۳)

یعنی جب عشق میں مطلقاً یہ خاصیت ہے تو عشق حقیقی میں تو بدرجہ اتم ہوگی کہ آدمی ایک ہی کا ہو رہے گا اس واسطے جرأت کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ گاؤں خریدنا جائیداد خریدنا مال و متاع بڑھانا گو فی نفسہ منافی طریق نہیں لیکن اگر محبت کا غلبہ ہوا تو یہ خود ہی چھوٹ جائیں گے (۴) میں نہیں چھڑاتا مگر کیا کیجئے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہتیں۔ دو تو جمع نہیں ہوسکتیں ہاں یہ ممکن ہے کہ اصلی تلوار کو بدل دیا جاوے اور اس کی جگہ لکڑی کی تلوار رکھ دی جاوے اس سے نہ نیام کو انکار اور اصلی تلوار کا بھی ضرر نہیں، لیکن جو شخص تلوار کو جانتا ہے اس سے کیا ممکن ہے کہ اصلی کی جگہ لکڑی کی رکھ لے اسی طرح جس دل میں اللہ میاں آگئے ہوں اُس میں دوسرے کی گنجائش کہاں دونوں تو جمع نہیں ہوسکتے ہاں یہ ممکن ہے کہ اللہ میاں کو چھوڑ کر دوسرے کو جگہ دے لے مگر کسی دل سے کوئی پوچھ لے کہ ایسا کوئی کرسکتا ہے یعنی اللہ میاں کو کوئی چھوڑ سکتا ہے۔

تصوف کی حقیقت

غرض یہ تو غلبہ کے آثار ہیں اس میں آدمی مغلوب ہوتا ہے مگر حکم فن وہی ہے کہ جو چیز جائز ہے شرعاً اس کو کوئی منع نہیں کرسکتا جبکہ حق تعالیٰ نے گاؤں اور

(۱) ''تیرا عشق اپنے جیسے مٹی پانی والے سے دل سے صبر اور آرام لے جاتا ہے'' (۲) ''جب محبوب کی نظر میں تمہارا مال اور زر نہیں آتا تو مال وزر اور خاک تمہارے نزدیک برابر ہیں'' (۳) ''تو تعجب کرتا ہے سالکین کے طریق سے جو کہ معنی کے دریا میں غرق ہوں'' (۴) ساز و سامان کا بڑھانا اپنی ذات کے اعتبار سے طریق تصوف کے خلاف نہیں ہے مگر محبت کے غلبہ میں یہ خود چھوٹ جاتے ہیں۔

جائیداد خریدنے کو اور چار عورتیں رکھنے کو جائز کہا تو کس کا منہ ہے کہ منع کرے اور جب خدا تعالیٰ نے ان چیزوں کو منع نہیں فرمایا تو یہ مانع فی السلوک کیسے ہوں گے؟ اس کا اعتقاد رکھنا حکم الٰہی کا مقابلہ ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ ان میں ایسا مشغول نہ ہو کہ اصل کام سے یعنی یادِ خدا سے رہ جاوے اور معاصی میں مبتلا ہو جاوے اس وقت حکم الٰہی ان کے منع کے ساتھ متعلق ہوگا جیسا کہ نصوصِ شرعیہ سے ظاہر ہے غرض تصوف سوائے شریعت کے کوئی نئی چیز نہیں ہے مگر دیکھ لیجئے سلوک کا نام لے کر لوگ کس مشکل میں ڈالتے ہیں اور دنیا کو جب تک بالکل ترک نہ کرے اس کو سالک ہی نہیں سمجھتے گو آج کل اس ترک کی حقیقت اضاعت حقوق ہے (۱) جو کسی طرح بھی جائز نہیں اور کبھی وہ ذریعہ وصول الی اللہ کا نہیں ہوسکتا۔

تصوف میں اصطلاح ''مقام'' کی حقیقت

جو حقیقت سلوک کی میں نے عرض کی کیسی صاف ہے میں اس واسطے کہتا ہوں کہ تصوف کوئی مشکل چیز نہیں مگر کرنا شرط ہے میری باتوں سے تو کوئی کام بھی نہیں ہوسکتا۔ غرض سلوک کا کوئی جز و کوئی انوکھی چیز نہیں جیسا لوگوں نے جہل سے سمجھ رکھا ہے مثلاً لفظ ''مقام'' ہے اس مقام ہی کے معنے لوگوں نے کیا کیا تراشے ہیں چنانچہ آجکل اگر کوئی ذرا پڑھا لکھا فقیر ہوا تو وہ مقام کے معنی لیتا ہے جبروت و لاہوت، یہ علماء تصوف سے چرائے ہوئے لفظ ہیں عوام کے سامنے ان لفظوں کو بولا جاتا ہے کہ معلوم ہو کہ یہ بھی اہل فن ہیں حالانکہ اُن کو خبر بھی نہیں کہ یہ چیز کیا ہیں بس جبروت لاہوت یاد ہے میرا مطلب یہ نہیں ہے جبروت و ملکوت (۲) مہمل ہیں لیکن یہ مراتب موجود ہیں اصطلاح صوفیاء میں جس کو مقام کہتے ہیں اور جس کا مجھے

(۱) حقوق کو ضائع کرنا (۲) یہ تصوف کے اصطلاحی الفاظ ہیں مرتبہ صفات جمالیہ کو لاہوت اور حقیقتِ محمدیہ اور مرتبہ صفات تفصیلیہ کو جبروت اور اعیان ثابتہ اور حقیقت آدم اور عالم ارواح و مثال کو ملکوت کہتے ہیں۔

انتہائی درجہ بیان کرنا ہے وہ یہ نہیں بلکہ نیک کام اختیار کرنے کو مقام کہتے ہیں اور اتنی ہی تخصیص اور ہے کہ نیک کام سے مراد بھی عمل باطنی ہے عمل ظاہری کو مقام نہیں کہتے مثلاً نماز پڑھنے کا کوئی عادی ہوگیا اور اچھی طرح اس کی تکمیل کرلی تو ان کی اصطلاح میں اس کو مقام نماز کو طے کرنے والا نہ کہیں گے بلکہ اعمالِ باطنہ کا نام مقام ہے جیسے تواضع یعنی اپنے آپ کو کمتر سمجھنا۔ یا اخلاص یعنی عمل کو بلا کسی غرض کے کرنا یا جیسے صبر وشکر رضا توحید وغیرہ جن کی تفصیل کتب فن میں موجود ہے ان کے حاصل کرنے کو اصل سلوک مقامات کہتے ہیں تو جب کہیں فلاں شخص نے مقام تواضع طے کرلیا تو معنی یہ ہوں گے کہ اس ملکہ کی تکمیل کرلی وعلی ہذا القیاس۔

خوارقِ عادت کا حصول سلوک نہیں

سلوک اُڑنے کو نہیں کہتے نہ دریا پر چلنے کو کہتے ہیں کیونکہ سالک آدمی ہوتا ہے نہ وہ مچھلی بن سکتا ہے نہ پرند بن سکتا ہے لوگوں نے خوارق ہی کو کمال سمجھ لیا ہے اور اسی کو غایت سمجھتے ہیں یہ حاصل ہوگیا تو بس کامل ہوگئے اور یہ کمالات نہ پیدا ہوئے تو بس سب محنت کو رائیگاں سمجھتے ہیں لیکن قرآن وحدیث میں تو کہیں ان باتوں کا پتہ ہے نہیں۔

حصولِ مقامات میں ترتیب

مقامات یعنی اعمال کو قلب کے تصفیہ کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اور یہی تصفیہ قلب غایت ہے ان اعمال کی اور یہی بڑی چیز ہے، رہا پانی پر چلنا اور ہوا میں اڑنا اس کو مقصود سمجھنے کے تو یہ معنی ہیں کہ انسانیت سے حیوانیت کی طرف مسخ ہوجاؤ[1] اور آدمی سے مچھلی یا پرند بن جاؤ۔ حاصل یہ کہ بعضے اعمال وہ ہیں جن کو اختیار کیا جاتا ہے اور بعض اعمال وہ ہیں جن کو ترک کیا جاتا ہے۔ مثلاً ریا تکبر وغیرہ یہ

(۱) بجائے انسان کے جانور بن جائے۔

سب مقامات ہیں اور اُن کی تحصیل و تکمیل کا نام سلوک ہے اس تحصیل میں بعض مقدم اور موخر ہوتے ہیں جیسے میں نے مثال دی تھی کہ الف بے اور سپارہ کا پڑھنا کہ دونوں میں ترتیب ضروری ہے بلا اس کے تحصیل نہیں ہوسکتی اور بعضے دو دو ایک ساتھ حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اور اس کا فیصلہ کہ کن کن میں ترتیب ہے اور کون کون مجتمع ہوسکتے ہیں یہ شیوخ کی رائے پر ہے جیسے طبیب کہ بعض معالجات کو ترتیب وار رکھتا ہے جیسے منضج اور مسہل (۱) کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ ان میں تقدیم و تاخیر ہو اور دونوں کو جمع کر دیا جاوے اور نہ یہ ہوسکتا ہے کہ ترتیب بدل دی جاوے کہ اول مسہل دے دے اور پھر منضج اور بعضے کو جمع بھی کرتا ہے جیسے مسہل اور مُدِرّ کہ ایک ہی دن میں دیئے جاتے ہیں۔

غرض اہل فن جانتے ہیں کہ کون سا کام ترتیب کے ساتھ ہونا چاہیئے اور کون سے کام مجتمعاً بھی ہوسکتے ہیں اس کے کچھ قواعد بھی ہیں مگر نہ ان کے بیان کی یہاں گنجائش ہے اور نہ اس وقت اُن کے بیان سے کچھ نفع ہوسکتا ہے کیونکہ کوئی چاہے کہ اس وقت ان قواعد کو سن کر اپنے معالجہ باطن میں ان سے کام لے لے اور طبیب معالج کی طرف رجوع سے مستغنی ہوجاوے تو یہ ممکن نہیں (۲) اور اس کی مثال بالکل ایسی ہوگی کہ بروقت معالجہ طبیب کی طرف رجوع کرنا کارآمد ہے۔ یہ کارآمد نہیں کہ طبیب مریضوں کے سامنے ان قواعد کی تقریر کردے کیونکہ اس سے وہ علاج نہیں کرسکتے بلکہ ضرورت اسی بات کی ہے کہ جب علاج کی ضرورت پیش آوے اس سے جزئیات کو دریافت کرلیں۔ اسلم اور اسہل طریق (۳) یہی ہے اس واسطے ان قواعد کا بیان تو فضول ہے جو ترتیب اور جمع کے متعلق ہیں

---

(۱) جیسے طبیب پہلے ایسی دوا دیتا ہے جو طبیعت کو نرم کرے پھر دستوں کی دوا دیتا ہے (۲) کوئی خود اپنا علاج کرنا چاہے اور یہ سمجھے کہ مجھے معالج کی ضرورت نہیں یہ ممکن نہیں (۳) آسان اور پرامن راستہ یہی ہے۔

ہاں اجمالاً اتنا بیان کرنا مقصود ہے کہ بعض میں ترتیب ہوتی ہے اس ترتیب میں آخری درجہ کیا ہے یعنی سب مقامات طے ہوکر جس کے بعد مجاہدہ ختم ہوجاوے وہ کونسی چیز ہے۔

مقامات کا آخری درجہ اور اُس کی تعریف

سو اس میں اقوال مختلف ہیں ایک قول یہ ہے کہ رضا اخیر مقام ہے رضا مصدر ہے فاعل اس کا خواہ اپنے آپ کو کہے تو معنی یہ ہونگے کہ آپ راضی ہوں حق تعالیٰ سے اور کسی فعل سے حق تعالیٰ کی کشیدگی اور ناگواری نہ رہے یا فاعل حق تعالیٰ کو کہئے تو یہ معنی ہونگے کہ حق تعالیٰ آپ سے راضی ہوگئے اور ان دونوں میں تلازم ہے (۱) اور مقام ایک ہی ہے نام اس کا رضاءِ حق رکھ دیا رضاءِ عبد، تلازم کے لفظ پر ایک شعر یاد آیا اس سے اس مضمون کی توضیح ہوجاتی ہے ؎

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف گر بکشد زہے طرب ور بکشم زہے شرف (۲)

غرض رضا کے دونوں معنی متلازم ہیں اور ہر حال میں یہ امر اس میں مشترک ہے کہ خدا تعالیٰ کے کسی تصرف سے اس کو ناگواری نہ ہو رضا کے معنی آپ نے سن لئے کہ حق تعالیٰ کے کسی فعل سے ناگواری نہ ہو اور ایک صورت میں تو یہ اس کے معنی ہی ہیں یعنی جب اس کا فاعل بندہ کو قرار دیا جاوے اور جب فاعل حق تعالیٰ کو قرار دیا جاوے جب یہ اُس کے لفظی معنی نہ سہی کیونکہ لفظی معنی تو یہ ہیں کہ حق تعالیٰ بندہ سے راضی ہیں مگر باعتبار وقوع کے یہ بات اس کو لازم ہے کہ جب کسی بندے سے حق تعالیٰ راضی ہوتے ہیں تو اس کی حالت یہی ہوتی ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ہر

(۱) یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں (۲) ''محبوب کا دامن ہاتھ میں آنا چاہیئے پھر وہ ہم کو کھینچ لے تب وصل ہے اور ہم اس کو کھینچ لیں تب بھی وصل ہے''۔

کام سے راضی ہوتا ہے غرض مقام رضا میں یہ ضرور ہوتا ہے کہ بندہ حق تعالیٰ کے ہر کام سے راضی ہوتا ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ گو طبعاً ناگواری ہو مگر عقلاً شکایت نہ ہو۔

راضی برضاءِ الٰہی کا مطلب

اس میں بھی جاہلوں نے کیا کیا خبط کئے ہیں رضا کی شرح یہ کرتے ہیں کہ ایسی حالت ہو کہ تیر بھی لگے تو اُف منہ سے نہ نکلے اور خبر تک بھی نہ ہو ایسی ہی شرحوں سے تصوف تکلیف مالایطاق کا نام سمجھ لیا گیا ہے(۱) اور اسی وجہ سے اس کے نام سے لوگ ڈرتے ہیں کہ ہمارے بس کا ہے ہی نہیں۔ کیوں بکھیڑے میں پڑتے ہیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ طبعاً ناگوار ہونا رضا کے خلاف نہیں ہاں عقلاً ناگواری نہ ہونی چاہیئے مثلاً بیٹا مرے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ قلب میں شکوہ شکایت نہیں اور یہ تو نہیں کہتا کہ نہ مرتا تو اچھا ہوتا رنج طبعی تو جتنا بھی ہو بُرا نہیں صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ ناگواری عقلی تو نہیں ہے اور ناخوشی وکراہت تو نہیں ہے یعنی یہ سمجھے کہ بالکل ٹھیک ہوا۔ جو کچھ ہوا اور یہی مناسب تھا اور اسی میں حکمت ہے پھر اس کے ساتھ گو طبعاً ناگواری ہو۔

خوشی اور غمی کا اجتماع ممکن ہے

اور اس سے تعجب نہ کیجئے کہ ناگواری طبعی اور رضامندی عقلی جمع کیسے ہو سکتے ہیں ظاہراً تو دونوں ضدیں معلوم ہوتی ہیں اس کی ایک مثال ہے جس سے یہ اشکال رفع ہو جاتا ہے اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ مقام کوئی زیادہ مشکل نہیں لوگ ایسی باتوں کو محققین سے حل نہیں کراتے خود ہی بیٹھے بیٹھے جو سمجھ میں آتا ہے اس پر رائے قائم کر لیتے ہیں چنانچہ بہت سے لوگ اسی کے متعلق سمجھے بیٹھے ہیں کہ خوشی ناخوشی کیسے جمع ہو سکتے ہیں۔ اور اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ کسی سے پوچھ لیں

(۱) تصوف ایسی تکلیف کا نام سمجھتے ہیں جس کی انسان طاقت نہ رکھتا ہو۔

خوب سمجھ لیجئے کہ یہ ممکن ہے کہ طبعاً گرانی ہو اور عقلاً نہ ہو اس پر کوئی عقلی اشکال نہیں ہوتا کیونکہ اس میں نہ تناقض ہے اس واسطے کہ تناقض میں وحدت حیثیت شرط ہے اور جب ایک میں قید عقلاً کی ہے اور دوسرے میں طبعاً کی تو تناقص کہاں ہوا(۱) اور نہ تضاد ہے (۲) کیونکہ دونوں کا مفہوم وجودی نہیں تو ان کا اجتماع ممتنع عقلی تو ہے نہیں (۳) اور اس کو دوسرے لفظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کا اجتماع عقلاً ممکن ہے پھر تعجب ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ اس میں کیوں اشکال کرتے ہیں۔ ہاں عوام کی عقل میں یہ بات نہ آوے یا اس کو مستبعد کہا جاوے تو کسی قدر برمحل تھا(۴) مگر میں جو مثال ابھی دیتا ہوں اس سے بہت آسانی سے یہ بات عقل میں آجاتی ہے اور استبعاد مطلق بھی نہیں رہتا وہ مثال یہ ہے کہ خدانخواستہ کسی کے پھوڑا نکل آوے اور سخت تکلیف ہو جراح (۵) کو دکھلایا اس نے کہا سوائے شگاف (۶) کے کچھ علاج نہیں دو چار ماہر جراحوں کو دکھلایا سب نے بالاتفاق یہی کہا غرض یہ بات طے ہوگئی کہ شگاف ہی دینا پڑے گا۔ صحت سب کو عزیز ہے بمجبوری اس کو منظور کیا جاوے گا اور اس کو امر کریں گے کہ شگاف دے دے (۷) اس میں تکلیف ضرور ہوگی اس کو گوارا کریں گے۔ اب چروانے بیٹھے اور پھوڑا تھا بڑی قسم کا جس کا اثر گوشت کے اندر ہڈی کے قریب تک تھا۔ جراح نے گہرا شگاف دیا بس ایک آہ نکلی اور آنسو بھی نکل آئے گو کیسے ہی مرد اور شیر دل تھے مگر ضبط نہ ہوسکا اور منہ بھی بنایا اور سارا بدن کانپ گیا۔ خیر شگاف ختم ہوا اور بہت سا مواد نکل گیا اور بدگوشت کو کاٹ کر مرہم لگا کر پٹی باندھ دی گئی۔

(۱) اس میں کوئی محال لازم نہیں آتا دونوں جمع ہوسکتے ہیں (۲) دونوں ایک دوسرے کی ضد ہی نہیں کہ جمع نہ ہوسکیں (۳) عقلاً اُن کا جمع ہونا ممنوع نہیں ہے (۴) ان کی عقل میں اس بات کا آنا ممکن نہیں ہے تو ایک درجہ میں درست بھی ہے (۵) اس شخص کو کہتے ہیں جو پھوڑے پھنسی کا علاج چیرا دے کر فاسد مادہ نکال کر کرتا ہے (۶) چیرا دینے کے (۷) اس کو چیرا دینے کے لئے کہیں گے۔

اب مریض صاحب ہنسے اور اس مواد کو دیکھ کر خوش ہوئے کہ اچھا ہوا خدا نے اس کو دفع کیا اور چاروں طرف سے لوگ مبارک باد دینے لگے، انہوں نے حکم دیا کہ دے دو جراح کو دس روپے اجرت اور بیس روپے انعام اور جوڑا بھی دو بہت ہوشیار اور تجربہ کار ہے اور وفادار ہے بہت سوچ سمجھ کر اور دل سے اس نے یہ کام کیا۔ یہ مثال آپ نے سن لی۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ یہاں رضامندی اور ناگواری دونوں جمع ہیں یا نہیں اگر ناگواری نہیں ہے تو آنسو کیوں نکلے اور آہ کیوں کی اور منہ کیوں بنا اور بدن کیوں کانپا اور اگر رضامندی نہیں ہے تو دس روپیہ اور بیس روپیہ کیوں دیئے اور اس کی تعریف کیوں ہورہی ہے بس یونہی کہا جاوے گا کہ ناراضی بھی ہے اور رضامندی بھی ہے یعنی عقلاً تو اس مثال سے یہ مضمون بہت ہی واضح اور عام فہم ہوگیا اور اس پر کوئی اشکال واستبعاد باقی نہیں رہا کہ رضا اور سخط دونوں جمع ہوسکتے ہیں (۱) باختلاف حیثیت تو اب رضا کے معنی پر یہ شبہ نہ رہے گا کہ بندہ مصیبت میں تکلیف اور رنج ناگواری بھی محسوس کرے اور حق تعالیٰ کے ساتھ رضا بھی قائم رہے کیونکہ تکلیف اور رنج کا احساس طبعی ہے اور راضی رہنا عقلی ہے۔

رضا میں منتہی اور متوسط کا فرق

غرض مقام رضا یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ہر فعل سے عقلاً راضی ہو گو طبعاً ناگواری بھی محسوس ہو جیسے بیٹے کے مرنے سے رنج ہوا اور آنسو بھی نکل آئے مگر عقلاً جانتا ہے اور اچھی طرح یہ بات ذہن نشین ہے کہ ٹھیک وہی ہے جو حق تعالیٰ نے کیا ایسے شخص کو مقام رضا حاصل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رضا میں خوش طبعی ہونا شرط نہیں ہاں بعض بندگان خدا کو طبعی خوشی بھی ہوتی ہے اور یہ حالت ہوتی ہے کہ تکلیف میں ہنستے تھے اور قہقہے

(۱) اور اس پر کوئی اشکال نہ رہا کہ خوشی اور ناخوشی دونوں جمع ہوسکتے ہیں۔

لگاتے تھے مگر یہ غلبۂ حالت ہے اور یہ حالت ظاہراً بہت اکمل معلوم ہوتی ہے(۱) مگر یاد رکھئے کہ یہ حالت توسط میں ہوتی ہے اور انتہا اور کمال میں یہ حالت نہیں ہوتی(۲) دیکھئے انبیاء علیہم السلام کی حالت یہ نہیں ہوئی اور مسلم ہے کہ وہ سب سے اکمل ہیں تو یہ حالت کمال کی کیسے ہوسکتی ہے بات تو یہ ہے کہ متوسطین استغراق میں ہوتے ہیں ان کو احساس رنج والم کا نہیں ہوتا جیسے کسی کو کلورافارم سونگھا کر آپریشن کیا جائے کہ اس کو تکلیف کا احساس نہ ہوگا اور منتہی کی حالت یہ ہے کہ کرسی پر بیٹھ کر آپریشن کرالیا جس سے تکلیف کا احساس پورا ہوا پیشانی پر بل پڑ گیا مگر ایسا قوی دل اور شیر مرد ہے کہ جھیل گیا انبیاء علیہم السلام کی حالت یہی ہے کہ ان کو تکلیف کا احساس پورا ہوتا ہے مگر قوت قلب اس قدر ہوتی ہے کہ سب کو جھیل جاتے ہیں آثار حزن کے بھی ظاہر ہوتے ہیں اور واقعی حزن ہوتا ہے جیسے کہ کرسی پر بیٹھ کر آپریشن کرانے والے کو تکلیف کا پورا احساس ہوتا ہے لیکن رضاءِ عقلی غالب رہتی ہے اور حدود سے متجاوز نہیں ہوتا ان کا رتبہ استغراق والے سے بڑھا ہوا ہے جیسے کرسی پر بیٹھ کر آپریشن کرانے والے کا رتبہ کلورافارم سونگھنے والے سے بڑھا ہے، خوب سمجھ لو اولیاء کا بیٹا مرے تو ہنسیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کا انتقال ہو تو رو دیں اور فرمادیں ((اَنَا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ))(۳) اور یہاں پر کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غلبہ غم میں ایسا ہوگیا ہوگا باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اس حالت کو یعنی مصیبت کے وقت مطلق غم نہ ہونے کو اس سے اچھا سمجھتے ہوں کیونکہ حدیث میں اس کے خلاف تصریح موجود ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ سے آنسو جاری دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو تو منع فرماتے ہیں اور خود روتے ہیں فرمایا: ((تِلْكَ رَحْمَةٌ)) یعنی یہ

(۱) زیادہ کامل (۲) تصوف کے درمیانی درجہ میں یہ حال ہوتا ہے انتہائی اور کمال کے درجہ میں پہنچ کر یہ حال نہیں ہوتا (۳) ''ابراہیم تیری جدائی سے میں غمگین ہوں''۔

وہ رونا نہیں ہے جس سے منع کیا جاتا ہے یہ تو رحمت ہے جس کو حق تعالیٰ نے مومن کے قلب میں رکھا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالت کوئی گھٹی ہوئی حالت نہیں ہے(۱) کیونکہ اس کی حضور ﷺ نے مدح فرمائی(۲) اور ایسے الفاظ سے مدح فرمائی جن سے اچھی طرح مفہوم ہوتا ہے(۳) کہ اس کا خلاف مذموم ہے(۴) کیونکہ اس کو رحمت فرمایا اور رحم کا خلاف ظاہر ہے کہ مذموم ہے پس ثابت ہوا کہ اکمل حالت یہی ہے اور مصیبت میں ہنسنا اس سے کم درجہ کی حالت ہے جو کہ استغراق کے غلبہ میں ایسا ہوتا ہے اور غلبہ متوسط ہی کو ہوتا ہے اور منتہی کو غلبہ نہیں ہوتا ایک ہوش والا ہے اور ایک جوش والا متوسط اور منتہی کی مثال ہانڈی کی سی ہے کہ اول اس میں کیسے جوش اٹھتے ہیں اور اخیر میں جوش نہیں رہتا اول کے جوش کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ آنچ کا اثر قبول کرنے کی اسمیں زیادہ قابلیت ہے اور اخیر میں یہ انفعال نہیں رہا(۵)۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ خیال صحیح نہیں آنچ کا اثر اخیر ہی میں زیادہ ہے کیونکہ فاعل دیر سے اثر کر رہا ہے۔ نیز منفعل جو مانع قبول اثر حرارت کا تھا وہ اب کم ہوگیا ہے وہ مانع پانی تھا پکتے پکتے پانی کم رہ گیا اور ادھر قوتِ انفعال بڑھی اور ادھر قوت فاعل بڑھی تو ضرور ہے کہ اب اثر زیادہ ہوگا(۶) اور اس کے لئے دلیل کی ضرورت ہی نہیں یہ تو مشاہدہ ہے اور سب کے نزدیک مسلّم ہے گویا بدیہی بات ہے(۷) لیکن اب جوش نہیں ہوتا بلکہ اب حالت یہ ہے کہ آگ سے جگر تو جلتا ہے اور تھوڑی دیر میں ہانڈی میں جو کچھ ہے اگر چولہے سے ہانڈی کو اتار نہ لیا گیا تو وہ سب چیز جل کر کوئلہ ہوجاوے گی مگر جوش میں نہیں آئیگا۔

(۱) ادنی حالت نہیں ہے (۲) تعریف (۳) اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے (۴) بُرا ہے (۵) آخر میں یہ کیفیت نہیں رہی (۶) ایک طرف سے اثر کرنے کی طاقت بڑھی دوسری طرف سے اثر قبول کرنے کی طاقت بڑھی تو یقیناً اثر زیادہ ہوگا (۷) یہ تو تسلیم شدہ بالکل ظاہر بات ہے۔

منتہی کی مثال

یہی حالت منتہی کی ہے کہ جوش تو اس میں مطلق نہیں حتی کہ کوئی ناواقف سمجھتا ہے کہ یہ متاثر ہی نہیں ہوتا لیکن وہ جلا بھنا ایسا ہے کہ دوسرے بھی اس کے اثر سے جل جاتے ہیں ان کے کلام سے آگ لگ جاوے مگر خود ظاہراً ٹھنڈے ہیں اور کسی کو ان کی حرارت کا پتہ بھی نہیں چلتا جیسے بعض ادویات ہوتی ہیں کہ دیکھنے میں اور چھونے میں ان میں ذرا بھی گرمی نہیں اور کھانے سے وہ حرارت(۱) پیدا ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ بلکہ ایسی ہوتی ہیں جیسے برف کہ چھونے میں ٹھنڈی حتی کہ دوسرے میں بھی برودت فعلی پیدا کردے(۲) اور پینے سے گرمی ہوتی ہے بعض اہل اللہ کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ہر شخص ان کو پہچان بھی نہیں سکتا ان کو معمولی نظر سے دیکھا جاوے تو بجائے اس کے کہ ان میں کوئی سوز و گداز گی (۳)محسوس ہو سوز و گداز کی ضد محسوس ہوتی ہے جیسے برف کہ ہاتھ سے چھونے سے بجائے گرمی کے سردی محسوس ہوتی ہے اس کی واقعی تاثیر معلوم کرنے کے لئے شرط ہے کہ اس کو پیا جاوے۔

اہل اللہ کی پہچان کا طریقہ

اسی طرح اس شخص کی واقعی حالت کو معلوم کرنے کے لئے شرط ہے کہ اسی کے پاس چند روز رہا جاوے اور خلا ملا(۴) پیدا کیا جاوے آجکل یہ بھی خبط ہے کہ ایک ملاقات میں اثر معلوم کرلینا چاہتے ہیں۔ حضرت یہ لوگ وہ ہیں کہ اگر چھپنا چاہیں تو برسوں بھی کسی کو پتہ نہیں چل سکتا یہ مطلب نہیں کہ ایک ملاقات میں کچھ اثر نہیں ہوتا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک ملاقات میں اثر نہ پاویں تو فیصلہ نہ کرلیں۔

---

(۱) گرمی (۲) ٹھنڈک پیدا کردے (۳) جلنا جلانا (۴) میل جول۔

ممکن ہے کہ کوئی مانع محسوس ہونے میں مثلاً ادراک منفعل کا ہونا(۱) یا خود فاعل کا اپنے آپ کو چھپالینا۔

متوسط اور منتہی کی حالت میں فرق

غرض جوش تو درکنار منتہی میں بعض وقت بظاہر جوش کی ضد محسوس ہوتی ہے جیسے برف میں واقع میں حرارت ہے مگر محسوس برودت ہوتی ہے اگر ضد بھی نہ ہوتو یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ جوش نہیں ہوتا اور تیار ہانڈی کی طرح ہوتا ہے کہ ابلتی نہیں ہے مگر جو جو کمالات حاصل ہونے والے تھے سب ہو چکے کوئی حالت منتظرہ باقی نہیں اور متوسط ادھر کچی ہانڈی (۲) کی طرح ہے کہ ابل رہی ہے اور جوش اس کا دبتا نہیں مگر سب جانتے ہیں کہ قابل انتفاع نہیں (۳) ابھی گوشت کی بساند بھی نہیں گئی (۴) ابھی بہت سے تقلبات ہوں گے (۵) بھونا جاوے گا، شوربا دے کر پکایا جاوے گا تب کسی کے سامنے رکھنے کے قابل ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ غلبہ متوسط کو ہوتا ہے نہ کہ منتہی کو تو یہ بات کہ مصیبت میں خوش طبعی بھی ہو اور ہنسی آوے یہ متوسط میں ہوگی اور منتہی کو الم (۶) کا احساس ہوگا ہاں عقلاً راضی ہوگا۔ تو رضا میں خوش طبعی ہونا شرط نہیں ہاں خوش عقلی ہونا چاہیئے کہ آدمی دل سے سمجھتا ہو کہ حق تعالیٰ کا جو فعل بھی ہے وہ عین حکمت اور مناسب ہے اس سے تنگدلی نہ ہو گو طبعاً آزردہ ہو (۷) اور اس کے زوال کا طبعاً خواہشمند ہو اس تقریر سے بخوبی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ رنج کے ساتھ رضا جمع ہوسکتی ہے پس بعض نے اس کو اخیر کہا ہے اور اس کے اخیر مقام ہونے ہی کی فرع ہے کہ تمام جنت کا بیان کر کے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَرِضْوَانٌ مِنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾

(۱) مثلاً جو شخص ان سے متاثر ہونا چاہتا ہے اس کی قوت متاثرہ کمزور ہو (۲) اس سالن کی ھنڈیا کی طرح ہے جو ابھی آدھا پکا آدھا کچا ہو (۳) سب کو پتہ ہے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے (۴) کچے گوشت کی بو بھی ختم نہیں ہوئی (۵) ابھی اس میں بہت سے تغیرات آئیں گے (۶) تکلیف (۷) غمگین۔

سب سے بڑی نعمت

یعنی جنت تو نیک بندوں کے لئے ہے ہی رضاء الٰہی اس سے بھی بڑی نعمت حاصل ہوگی اس کی تفسیر حدیث میں آئی ہے کہ جنتی جب جنت میں چلے جاوینگے اور نعماءِ جنت سے متمتع ہوں گے حتی کہ اُن کو دیدارِ الٰہی بھی نصیب ہوگا اس کے بعد جو خوشخبری سنائی جاوے گی کہ ایک دولت اور بھی دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ آج سے کبھی ہم تم سے ناراض نہ ہونگے یہ وہ نعمت ہوگی کہ تمام نعمتوں اور عیشوں کی تکمیل اس میں ہوگی کیونکہ احتمال ناراضی کا باقی رہے تو سب نعمتیں خاک ہیں کیونکہ ہر وقت یہ خطرہ لگا ہوا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ ناراض ہوکر یہ چھن جاویں یہ ایسا ہے کہ کسی کے سامنے پلاؤ قورمہ اور تمام دنیا کی نعمتیں رکھیں مگر اس سے کہہ دیں کہ ہم کو اختیار ہے کہ جب چاہیں سامنے سے اٹھالیں تو وہ اُن سے کیا خاک حظ پا سکتا ہے(۱) وہ ان کو چکھے گا بھی نہیں، دیکھا ہوگا کہ پھانسی والے کو جب پھانسی کے لئے کھڑا کرتے ہیں تو اس سے پوچھتے ہیں کچھ کھانا چاہتا ہے اور وہ جو مانگے دیا بھی جاتا ہے مگر حالت یہ ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ کانپتے ہیں اور اگر منہ میں رکھ بھی لے تو حلق سے نہیں اترتی وجہ اس کی کیا ہے یہی کہ اس کو معلوم ہے کہ یہ چیز مجھ کو دی جاتی ہے مگر ابھی چھین لی جاوے گی یہ خوف سب لذت کو مٹا دیتا ہے اور اس کے نزدیک مٹی اور مٹھائی برابر ہے، علی ہذا اگر جنت میں یہ خطرہ رہتا کہ شاید کبھی یہ نعمتیں چھن جاویں تو کسی نعمت کا بھی لطف نہ رہتا بلکہ سخت اذیت ہوتی کیونکہ جتنی نعمت بڑی ہو اتنی ہی اس کے چھننے سے تکلیف ہوتی ہے اور اسی طرح اس کے زوال کے خیال سے بھی معمولی نعمت کے سبب زیادہ تکلیف ہوگی۔ تو اہل جنت کو ایسی تکلیف ہوتی کہ دنیا میں کوئی بھی تکلیف ایسی نہیں، پس یہ تکلیف رفع ہوگی (۲) اس خوشخبری

(۱) اس کو کھانے کا کیا مزہ آئے گا (۲) دور ہوگی۔

سے کہ اب کبھی ہم ناراض نہ ہونگے تو یہ خوشخبری مکمّل ہوئی ہر نعمت کی (۱) اور جملہ نعمتیں بلا اس کے ناقص تھیں (۲) اس واسطے اس کو ''اکبر'' فرمایا گیا تو مقام رضا کو اخیر مقام کہنا ٹھیک ہوا۔

مقام رضاء جنت میں یقینی ہے

اور گو اس مقام کا حصول دنیا میں بھی میسر ہوجائے چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کو دنیوی زندگی ہی میں رضا کی بشارت رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ دے دینا اس کی دلیل ہے لیکن دنیا میں اس کا حصول مظنون اور درجہ خطر میں ہے (۳) اور آخرت میں اس کا حصول متیقن ہوگا (۴) چنانچہ دنیا میں کوئی قطب بھی ہوجاوے تب بھی احتمال ہے کہ کون سی خطا ہوجاوے جس سے رضا جاتی رہے۔

شریعت پر عمل سب کے لئے ضروری ہے

اور خطا سے مراد چوری اور زنا ہی نہیں ہے خاص بندوں کے لئے صرف یہی گناہ جرم نہیں ہیں بلکہ ذرا سا کلمہ بھی جرم ہوجاتا ہے اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی شریعت کوئی اور ہے جس میں جرائم بھی اور ہیں اور طاعات بھی اور ہیں جیسے بعض جہال کا خیال ہے کہ بزرگ ہوکر آدمی پر سے طاعات کم ہوجاتی ہیں شیخ صاحب نماز نہیں پڑھتے معتقدین کہتے ہیں کہ فنا ہوگئے ہیں قطرہ دریا میں مل گیا ہے کچھ مغائرت باقی نہیں رہی۔ پھر نماز پڑھیں تو اپنی نماز ہوگی اور کچھ گناہ بھی کم ہوجاتے ہیں حتی کہ عورتوں کا پردہ تک اُن سے نہیں رہتا بہت سے پیر مریدوں کے گھروں میں بے تکلف رہتے ہیں (نتیجہ یہ ہے کہ حمل رہ جاتے ہیں) یہ سب خرافات ہیں شریعت سب کے لئے ایک ہے جب تک حیات ہے اور ہوش وحواس ہیں کوئی طاعت

(۱) ہر نعمت کی تکمیل کرنے والی ہوئی (۲) اس کے بغیر نامکمل تھیں (۳) دنیا میں اس کا حاصل ہونا ظنی ہے۔ اور ضائع ہونے کا ہر وقت خطرہ ہے (۴) یقینی ہے۔

کم نہیں ہوسکتی نہ کوئی گناہ جائز ہوسکتا ہے پس ایک شریعت ہے جدا نہیں ہے۔

آداب کی رعایت

پھر ذرا سے کلمہ کے جرم ہونے کے کیا معنی۔ سو معنی یہ ہیں کہ وہ جرم قانونی نہیں ہے وہ ادب مجالست (۱) کا جرم ہوتا ہے کسی بڑے حاکم کے سامنے آپ جاویں تو کیا وہاں صرف قانونی جرائم کا خیال رکھتے ہیں اور اگر چوری اور ڈاکے کے آپ مجرم نہیں ہیں تو اس کے سامنے اکڑتے ہوئے اور اتراتے ہوئے اور بے تکلف چلے جاتے ہیں اور اگر آپ ایسا کریں تو کیا اعتراض نہ ہوگا اور اگر اعتراض ہو تو کیا یہ آپ کہہ دیں گے کہ میں نے کوئی قانونی جرم نہیں کیا۔ حضرت حاکم کے سامنے تو عجیب حالت ہوتی ہے جس کو سب جانتے ہیں کہ نگاہ اوپر کو نہیں اٹھتی زبان بات کرنے میں یاری نہیں دیتی پیر چلتے ہوئے کانپتے ہیں حالانکہ دنیا کا حاکم چیز ہی کیا ہے خدا تعالیٰ کی عظمت کا اگر انکشاف ہوجاوے تو خدا ہی جانے کیا حالت ہو شاید سانس لینا بھی جرم معلوم ہونے لگے جن بندگانِ خدا کو عظمت کا انکشاف ہوجاتا ہے ان کو ادب مجلس بھی کرنا پڑتا ہے۔

اولیاء اللہ پر مواخذہ

اور ان پر ذرا سی بے اعتدالی پر گرفت ہوتی ہے اگرچہ وہ قانونی جرم نہیں ہے۔ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ بارش ہوئی تو انہوں نے کہا آج کیا ہی موقع پر بارش ہوئی ہے الہام ہوا کہ او بے ادب اور بے موقع کب ہوئی تھی بس ہوش ہی تو اڑ گئے کہ کیا تھا شکر اور ہوگئی گستاخی اور جواب طلب ہے، یہ ان کے مواخذے

(۱) آداب مجلس کی رعایت نہ کرنے کا جرم ہے۔

ہیں اور ہم لوگ یہ لفظ کہیں تو شکر ہو اور باعث ثواب ہو۔ دیکھئے لفظ ''آج'' پر یہ عتاب ہوگیا(۱) ایک بزرگ کے وقت میں بن (۲) میں بارش ہوئی تو انہوں نے کہا یہ بارش بستی میں ہوتی تو کیا اچھا ہوتا بس اس لفظ پر اپنے رتبے سے گرادیئے گئے مگر ان کو خبر نہ ہوئی یہاں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ہر واقعہ کی خبر اولیاء کو ہو جانا ضروری نہیں لوگ اولیاء کو جانے کیا سمجھتے ہیں گو اپنے متعلق اکثر تو ہو جاتی ہے کبھی نہیں بھی ہوتی چنانچہ ان بزرگ کو نہ ہوئی دوسرے ایک بزرگ کو معلوم ہوگیا وہ ان سے ملنے آئے تھے مگر اس سے اس کو ظاہر نہ کیا اور وہاں سے جانے کے بعد ایک اور شخص سے کہا کہ ان پر عتاب ہے اس کلمہ کی وجہ سے اس نے کہا آپ نے ان سے اس کو ظاہر کیوں نہ کردیا کہا مجھے شرم آئی اور خیال کیا کہ ان کا دل بُرا ہوگا انہوں نے اجازت چاہی کہ میں ظاہر کردوں۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ انہوں نے ظاہر کردیا ان کی بُری حالت ہوگئی اور فرمائش کی کہ اس کی تدبیر میں میری مدد کرو اور وہ علاج یہ کیا کہ کہارسی سے باندھ کو مجھے گھسیٹو، چنانچہ ایسا کیا گیا۔ اللہ اکبر یہ ایک شیخ وقت کے حالات ہیں ؎

ایں چنیں شیخ گدائے کو بکو (۳)

یہ حالتیں اہل اللہ پر گذرتی ہیں۔

حصولِ تصوف کے لئے محنت ومشقت

لوگ تصوف کو نانی جی کا گھر سمجھتے ہیں یہ ہیں صوفی، یہ گت بنتی ہے صوفیوں کی رسیوں سے باندھ کر گھسیٹے جانے کا لئے تیار ہوجاؤ تب تصوف کا نام لو یہ نہیں ہے تصوف کہ فقط کپڑے رنگ لئے۔ کوئی دنیادار ان کی اس حالت کو دیکھتا تو

(۱) بزرگوں کی پکڑ ایسے جملوں پر بھی ہو جاتی ہے کہ لفظ ''آج'' سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ آج موقع کے مناسب ہوئی ہے ورنہ بے موقع بھی ہو جاتی ہے اس لئے مواخذہ ہوا (۲) درختوں کے جھنڈ میں بارش ہوئی (۳) ''اتنا بڑا اللہ کا ولی گلی گلی کوچہ کوچہ اس کی تلاش میں پھرتا ہے''۔

کیا کہتا سوائے اس کے کہ دماغ خراب ہوگیا ہے ابھی اچھے خاصے بیٹھے تھے۔ شیخ وقت ہیں بیٹھے پُچ رہے تھے (۱) یہ کیا خبط ہے کہ رسی سے گھسیٹے جارہے ہیں حضرت کیا کہا جاوے اس کے جواب میں سوائے اس کے کہ ؎

اے تراخارے بپانشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند (۲)

اُن سے پوچھئے کہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ میرے اوپر حق تعالیٰ کا عتاب ہے کیا گذری، اس کے مقابلہ میں جان کا جاتا رہنا بھی کچھ بات نہیں اور دنیا ان کو پاگل کہا کرے تو کیا ہوتا ہے وہ ان کو ہی پاگل سمجھتے ہیں، غیب سے آواز آئی کہ بس خبردار جو ایسی گستاخی کی اُس شخص نے فوراً رسی سے کھول دیا غرض دنیا میں رہتے رہتے جرائم کا احتمال اور اُن کے جرائم بھی اوروں سے نازک تو اس لئے کثرت جرائم کا احتمال رہا اور جرائم منقص یا مفوت رضاء ہوتے ہیں (۳) تو پھر دنیا میں کس کو اطمینان ہوسکتا ہے اور جب تک یہ اطمینان نہ ہوجاوے سب کام ناتمام ہے ہر وقت قسم قسم کے اندیشے لگے رہتے ہیں یہ کھٹکا بیشک جنت میں جاتا رہے گا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اہل جنت یہ معصیت بھی کریں تو رضا سلب نہ ہو (۴) بلکہ راز یہ ہے کہ پھر ان سے کوئی فعل خلاف رضا ہوگا ہی نہیں غرض رضا بڑی دولت ہے اور تمام مقامات کے لئے متمم ہے (۵) اس واسطے اس کو اخیر مقام کہا ہے۔

تصوف میں مقام فناء

اور بعض نے اخیر مقام ''فنا'' کو کہا ہے اور فنا کے معنی موت نہیں ہے کبھی کوئی سمجھے کہ خودکشی کرلو بس سارے مقام طے ہوگئے موت تو حیات کا آخر ہے مقامات

(۱) لوگ ان کا احترام کررہے تھے (۲) ''تمہارے پاؤں میں تو کانٹا بھی نہیں لگا تم ان لوگوں کی حالت کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا اور مصیبت کی تلوار چل رہی ہو'' (۳) ایسے جرائم کے ارتکاب سے کبھی اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی میں کمی واقع ہوتی ہے کبھی مقام پسندیدگی ہی ختم ہوجاتا ہے (۴) گناہ بھی کریں تو رضائے الٰہی ان سے نہ چھینی جائے (۵) تکمیل کرنے والی ہے۔

سلوک کا آخر نہیں بلکہ فنا سے مراد معاصی و نامرضیات کے متعلق تقاضائے نفس کا فنا ہوجانا ہے (۱) نفس کا جب تک تقاضا فنا نہیں ہوا اس وقت تک وہ فضولیات میں شہوات میں اغراض میں مبتلا کرتا ہے یہ باتیں جاتی رہیں اس کا نام فنا ہے اور تقاضے کا لفظ اس واسطے کہا کہ معاصی کی طرف نفس کا میلان بالکلیہ (۲) جاتا رہنا ضروری نہیں البتہ نفس کا تقاضا کھونے کی ضرورت ہے۔

مجاہدے کا فائدہ

اور یہ بات مجاہدہ سے حاصل ہوجاتی ہے مجاہدہ سے نفس ایسا رام ہوجاتا ہے (۳) جیسے شائستہ گھوڑا کہ قابو میں آجاتا ہے اور سوار کا مطیع ہوجاتا ہے (۴) اس کی قوت اور دوڑ دھوپ سب باقی رہتی ہے ہاں اتنا فرق ہوجاتا ہے کہ پہلے دوڑ دھوپ اپنی خواہش کے موافق تھی اور اب سوار کے موافق ہوگئی۔

خلاصہ یہ کہ نفس امارہ سے مطمئنہ (۵) رہ جاتا ہے نفس مطمئنہ کوئی دوسرا نفس نہیں امارہ اس کی ایک صفت تھی یہ صفت زائل دوسری صفت حاصل ہوجاتی ہے اور اسی کو مطمئنہ کہتے ہیں اور کسی وقت میں بھی یہ نہیں ہوتا کہ تقاضا معصیت کا بالکل جاتا رہے صفت تو باقی رہتی ہے مگر یہ حالت ہوتی ہے کہ گو کبھی تقاضا ہوتا ہے مگر رکنا معصیت سے مشکل نہیں ہوتا جیسے شائستہ اور تعلیمیافتہ گھوڑا بھی کبھی شرارت کرنے لگتا ہے مگر تعلیم کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سوار کو اس کے رام کرنے میں دقت نہیں ہوتی جیسے کہ غیر تعلیم یافتہ کے روکنے

(۱) نفس میں گناہ کرنے اور اللہ کی مرضی کے خلاف کام کرنے کا تقاضا ہی ختم ہوجائے (۲) کہ گناہوں کی طرف نفس کو بالکل خیال ہی نہ آئے یہ ضروری نہیں (۳) نفس سدھر جاتا ہے (۴) فرمانبردار (۵) نفس انسان کے اندر ایک قوت ہے جن سے کسی چیز کی خواہش کرتا ہے خواہ وہ خواہش خیر ہو یا شر اگر اکثر شر کی خواہش کرے اور شرمندہ نہ ہو اس وقت نفس امارہ کہلاتا ہے اور اگر اس پر شرمندہ ہونے لگے تو نفس لوامہ کہلاتا ہے اور اگر اکثر خواہش خیر کرے اس وقت نفس مطمئنہ کہلاتا ہے۔

میں ہوتی تھی یہ اثر آدمی کو محسوس ہونے لگتا ہے مثلاً پہلے عورت سے نگاہ کا روکنا بہت مشکل تھا گو محال اور خارج از وسع جب بھی نہ تھا(۱) ورنہ تکلیف مالا یطاق لازم آوے گی(۲)۔ اور ظاہر بھی ہے کہ یہ ہر وقت اختیار میں ہے کہ سر نیچے کر لے مگر اس سے بے چینی بہت ہوتی تھی اور قریب اسی کے تھا کہ اختیار سے خارج ہو اور آج مجاہدہ کے بعد یہ بات حاصل ہے کہ میلان بھی اس قدر نہیں یعنی ہر وقت نہیں مگر کبھی ہوتا ہے لیکن روکنے سے تکلیف نہیں ہوتی جتنی پہلے ہوتی تھی اور روکنے میں سہولت سے کامیابی ہوتی ہے پہلے تو نظر کے روکنے میں بسا اوقات کامیابی نہیں ہوتی تھی اور کامیابی ہو بھی جاوے تو تکلیف تو بے حد ہوتی تھی گو وہ تکلیف بھی اس تکلیف سے کم ہوتی ہے جو نظر سے پیش آتی ہے۔

بدنظری کے نقصانات

نظر غضب کی چیز ہے جیسے نظر بازوں کا خود اقرار ہے کسی نے کہا ہے ؎

بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدۂ(۳)

نظر واقعی ایسی چیز ہے کہ تیر سے زیادہ کام کرتی ہے اور گو نظر کے روکنے میں تکلیف ضرور ہوتی ہے مگر یہ تکلیف ذرا دیر کی ہے جب تک وہ چڑیل اور اس کا بناؤ سنگار زیور سامنے ہے اس وقت نظر کو روک لینا واقعی دل گردہ والے کا کام ہے مگر ایک دفعہ دل پر جبر کر کے روک لیا بس تکلیف ختم ہوگئی اور اگر نفس کے کہنے میں آ گئے اور ہمت سے کام نہ لیا اور دیکھ لیا تو بس چنگاری رکھی گئی۔ حظ تو بُرا بھلا بہت ہی تھوڑی دیر کا حاصل ہوا مگر ایسی آگ لگ گئی کہ تمام عمر نہیں بُجھ سکتی اور صرف گوشت پوست کو نہیں گلاتی بلکہ کپڑوں تک کو اور گھر بار کو پھونک دیتی ہے اور

(۱) اگرچہ ناممکن اور اپنی طاقت سے باہر جب بھی نہ تھا (۲) ورنہ یہ لازم آئیگا کہ اللہ نے انسان کو ایسی بات کا حکم دیا جس کی وہ طاقت نہیں رکھتا (۳) ''میں حیرت میں ہوں کہ بغیر کمان کے تیر کیسے مار دیا''

اس وقت تو کہنے کو صرف نظر کا گناہ تھا مگر وہ اصل گناہ سے ادھر دم نہیں لیتا اور ایک گناہ نہیں بلکہ بہت سے گناہوں کا تخم ہے (۱) نظر میں بالخاصہ یہ اثر ہے کہ ایک بار پر بس نہیں ہوتی بلکہ ہر مرتبہ اس کا داعی ہوتا ہے دوسرے کے لئے یہ اثر اور گناہوں میں نہیں ہے نظر کرنے والے کو چین بھی نہیں آتا اب دیکھ لیجئے کہ نظر کرنے میں تکلیف زیادہ ہے یا ایک دفعہ ہمت کر کے روک لینے میں مگر حیرت ہے کہ لوگ اس ذراسی نظر کے روکنے کی تکلیف سے بچنے کے لئے یہ تکلیف خریدتے ہیں اور ایک عجب بات ہے کہ نظر کے روکنے میں ذراسی تکلیف ہوتی ہے مگر اس کے بعد وہ راحت ہوتی ہے کہ جس کو حاصل ہوئی ہو وہی جانتا ہے اگر اُسی کا تصور کرلیا کرے تو نظر کے گناہ سے بچ سکتا ہے۔

مقام فناء کی تعریف

غرض نظر سے روکنے میں جو تکلیف ہوتی ہے مجاہدہ سے نفس میں یہ بات پیدا ہوجاتی ہے کہ پھر روکنا اس کا مشکل نہیں ہوتا اور وہ تکلیف نہیں ہوتی جو قبل مجاہدہ کے ہوتی تھی بس اسکا نام فنا ہے یعنی نفس کا تقاضا نہ رہنا اور یہ نہیں ہوتا کہ نفس میں میلان ہی کی قوت نہ رہے اور گناہ میں لطف ہی نہ رہے ہاں ابتدا میں بعض اوقات کیفیات کے جوش اور غلبہ سے یہ حالت ہوتی ہے کہ گناہ کی طرف اصلاً میلان ہی نہیں ہوتا مگر چونکہ کیفیات دیرپا نہیں ہیں یہ حالت بعد چندے زائل ہوجاتی ہے اور پھر یہ ایک کیفیت راسخہ اعتدال کے ساتھ مانع عن المعصیت (۲) نصیب ہوتی ہے جس کو عدم تقاضائے معصیت سے تعبیر کیا جارہا ہے۔

---

(۱) بیج ہے (۲) گناہوں سے روکنے والی۔

سالکین کی غلطی کا ازالہ

مگر سالک ناواقفی سے اس پہلی حالت کو دوسری حالت سے اکمل سمجھ کر سمجھتا ہے کہ مجھ کو تنزل ہوا اور میری حالت خراب ہوگئی اور اس طرح سے اس کو دھوکا ہوجاتا ہے اور شیخ سے شکایت کرتا ہے کہ مجھ میں وہ جوش نہیں رہا جو پہلے تھا معلوم ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ سے تعلق کم ہوگیا اور یہ سالک کے لئے ایسی بات ہے کہ جان دے دینا بھی اس پر گوارہ کرلیتا ہے سوحقیقت اس کی یہ ہے کہ تعلق کم نہیں ہوا ہاں رسوخ کیفیت سے اس سے افعال اعتدال اور سہولت کے ساتھ ہونے لگتے ہیں اس قلت جوش سے وہ سمجھتا ہے کہ محبت کم ہوگئی اور یہ نہیں جانتا کہ اگر جوش ہمیشہ رہے تو آدمی مرجاوے یہ حالت بُری نہیں، اُس کی شرح ایک بزرگ نے خوب کی تھی، یہ بزرگ مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی ہیں کسی نے مولانا سے یہ ہی شکایت کی تھی کہ اب ذکر میں وہ جوش وخروش نہیں رہا فرمایا پرانی جورو اماں ہوجاتی ہے(۱) دیکھئے لفظ تو بہت عامی ہے مگر حقیقت اس سے پوری ادا ہوتی ہے پس مطلب یہ ہے کہ جو جوش بی بی کی طرف پہلے تھا وہ پرانی ہونے کے بعد نہیں رہتا تو اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ محبت نہیں رہی محبت تو ابھی بڑھی ہے مگر جوش نہیں رہا۔

چنانچہ محبت کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک رئیس کی بی بی مرگئی تھی وہ بڑے آدمی تھے حکام میں بھی ان کی بڑی عزت تھی۔ کلکٹر صاحب تعزیت کے واسطے آئے اور مناسب الفاظ میں کہا کہ آپ کی بی بی کے مرجانے کا افسوس ہے۔ تو رئیس صاحب کہتے ہیں صاحب وہ ہمارا بی بی نہیں تھا وہ ہمارا اماں تھا۔ ہم کو روٹی پکا کر کھلاتا تھا، کلکٹر صاحب ہنسنے لگے۔ تو دیکھئے گو اماں نہ تھی مگر کیسی محبوب تھی اسی طرح سلوک

(۱) پرانی بیوی مثل ماں کے ہوجاتی ہے۔

میں ہے کہ اول جوش ہوتا ہے اس میں یہ حالت ہوتی ہے کہ کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی نہ مال اچھا لگے نہ دولت اچھی لگے نہ عورت اچھی لگے معصیت کی طرف میلان اصلاً بھی نہیں ہو یا یہ حالت گویا سلب حواس کی ہے۔(۱)

سالک کا پسندیدہ حال

پھر اس جوش کو سکون ہو جاتا ہے جو چیز اچھی معلوم ہوتی ہے مگر حالت یہ ہے کہ گو استحسان تو ہے مگر قصد معصیت کا نہیں ہوسکتا اگر کوئی سامنے آجاتا ہے تو سر نیچا ہو جاتا ہے اس وقت اس کو وہ حالت یاد کرنی چاہیئے کہ ایک وقت میں نگاہ کا روک لینا مشکل سمجھا جاتا تھا مگر اب مشکل نہیں یہ علامت ہے حصول دولت کی اور نجات ہے دھوکا سے پس یہ دولت فنا ہے اور یہ فنا تو مقام ہے۔

وحدت الوجود کا مطلب

ایک فنا درجہ حال میں بھی ہوتا ہے بعض کو مقام میں حال سے دھوکا ہو جاتا ہے وہ حال ہی کے ساتھ فنا کو خاص سمجھتے ہیں اس وقت نہ غیر حق کے ساتھ تعلق ہوتا ہے نہ غیر کی طرف نظر کرتا ہے ہر چیز میں اس کو خدا ہی خدا سوجھتا ہے اس وقت اس پر وحدت الوجود کا غلبہ ہوتا ہے اور ''ہمہ اوست'' کہتا ہے اور ''ہمہ اوست'' کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کوئی چیز نہیں سوائے حق تعالیٰ کے نہ یہ کہ سب چیز خدا ہے جیسے نقالوں نے یہی معنی لے رکھے ہیں اس کی نظر تو کسی پر سوائے خدا تعالیٰ کے پڑتی ہی نہیں۔ پھر یہ معنی کیسے لے سکتا ہے کہ سب چیز خدا ہے ہمہ اوست کی لوگوں نے کیا کیا گت بنائی ہے حالانکہ یہ بہت ہی ایک واضح مفہوم ہے اور ہمارے محاورات میں ایسے الفاظ موجود ہیں مثلاً کسی نے کلکٹر سے جاکر فریاد کی کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے تو

(۱) حواس کا احساس ہی ختم ہوگیا۔

اس نے کہا اس کی پولیس میں رپورٹ کرو اور کسی کو وکیل کرو اور مقدمہ باقاعدہ چلاؤ تو وہ کہتا ہے کہ ہمارے تو آپ ہی وکیل ہیں اور آپ ہی پولیس ہیں کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کلکٹر صاحب وکیل بھی ہیں یعنی وکالت کا پیشہ کرتے ہیں اور پولیس بھی ہیں یعنی کانسٹبل یا کوتوال بھی ہیں نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ پولیس کوئی چیز نہیں اور وکیل کوئی چیز نہیں آپ ہی ہیں جو کچھ ہیں اور اِسکا یہ مطلب بھی نہیں کہ پولیس اور وکیل کا وجود دنیا میں نہیں ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ آپ کے مقابلہ میں ان کا وجود کچھ ہستی نہیں رکھتا گویا کالعدم ہے جب ان کا وجود نہیں ہے تو کلکٹر صاحب ہی کا وجود ہے اور بجائے پولیس اور وکیل سب کے وہی ہیں اس معنی کر ان کو ہمہ اوست کہا جاسکتا ہے یہ معنی ہمہ اوست کے ہیں جو بالکل بے غبار ہیں لوگ فن کو جانتے نہیں نقل کرتے ہیں۔

فناء کے درجے

اور احوال نقل کرنے کی چیز نہیں اسی کو جامی رحمۃ اللہ علیہ غلبہ حال میں کہتے ہیں ؎

بسکہ درجانِ فگار و چشم بیدارم توئی ہر کہ پیدا میشود از دور پندارم توئی (۱)

جب کسی سے آدمی کو تعشق ہوتا ہے تو ہر چیز سے اُس کی طرف ذہن کو انتقال ہوتا ہے بلکہ ہر چیز میں وہی نظر آتا ہے جیسے کسی نے کہا ہے

ع جب کوئی بولا صدا کانوں میں آئی آپ کی

جامی سے کسی احمق نے جو اِن احوال سے ناآشنا اور منکر تھا۔ کہا اگر ''خر پیدا شود''۔ ملا جامی نے کہا ''پندارم توئی'' (۲) بس چپ ہی تو رہ گیا۔ یہ ملا جامی کی ظرافت ہے غرض فانی پر کبھی یہ فنا درجۂ حال میں بھی آجاتی ہے یہ حال ہے اور وہ مقام تھا مقام

(۱) ''میری جان میرے دل و دماغ میں تو ہی بسا ہوا ہے، جو کچھ دور سے دکھائی دیتا ہے میں خیال کرتا ہوں کہ تو ہی ہے'' (۲) کسی وحدت الوجود کے منکر نے ملا جامی سے سوال کیا کہ اگر گدھا پیدا ہو تو آپ کیا کہتے ہی جواب دیا کہ میں کہوں گا تو ہی ہے۔

اختیاری ہوتا ہے اور حال غیر اختیاری تو فنا کے دو مرتبے ہوئے فنا مقامی اور فنا خالی۔

مقام عبدیت

اور بعض نے عبدیت کو اخیر مقام کہا ہے یہ بھی ایک مقام ہے اس کو بقا بھی کہتے ہیں فنا کے بعد ایک حالت اور پیدا ہوتی ہے وہ عبدیت ہے۔ فنا میں حال غالب ہوتا ہے۔ اس حالت میں آکر وہ حال مغلوب ہوجاتا ہے اور سکون ہوجاتا ہے اور حالت بالکل مبتدی کی سی ہوجاتی ہے وہ حال عروج تھا اور یہ نزول ہے اس کو ایک مثال میں سمجھ لو۔ اس کی میں زیادہ شرح کرتا مگر وقت تنگ ہے لہذا ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں جس سے مسئلہ تو بخوبی سمجھ میں آجاوے گا فرض کرو ایک شخص شمس بازغہ تک پہنچا(۱) تو یہ منتہی ہے اب یہ میزان پڑھانے بیٹھا تو اس وقت میزان ہاتھ میں دیکھ کر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ یہ اور وہ طالب علم جو میزان پڑھتا ہے برابر ہے یا اس کی ان دو حالتوں کو یعنی وہ حالت جبکہ میزان شروع کی تھی اور یہ حالت جبکہ میزان لے کر پڑھانے بیٹھا ہے برابر سمجھ کر رائے قائم کرے کہ اس کی حالت پست ہوگئی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہلے تعلیماً میزان ہاتھ میں تھی اس کو عروج کہتے ہیں اور اب تعلیماً و تدریساً ہاتھ میں ہے اور نزول کہلاتا ہے اور نزول کے معنی کوئی یہ نہ سمجھے کہ ترقی سے اب تنزل ہوگا۔

کیونکہ یہ نزول وہ ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے ''ماالنھایہ''۔ جواب دیا گیا ''العود الی البدایہ'' یعنی پوچھا گیا انتہا کی حالت کیا ہے کہا ابتدا کی طرف لوٹ آنا یہ نزول صورۃً ہے جس میں ظاہری حالت بالکل ابتدا کی سی ہوتی ہے مگر فرق یہ ہے کہ پہلے خالی تھا اور اب پُر ہوگیا ہے پہلے خود فیض لیتا تھا اور اب دوسروں کو اس سے فیض پہنچے گا اس کو بقاء کہتے ہیں۔

(۱) کتاب کا نام ہے۔

مقامِ محبوبیت

اور بعض نے کہا ہے (تصریح تو نہیں ہے مگر تلویحات سے معلوم ہوتا ہے) کہ محبوبیت آخیر مقام ہے اور اس کا ثبوت ان کے پاس یہ حدیث ہے ((وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اَحْبَبْتُهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ سَمْعُهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرُهُ الَّذِیْ یَبْصُرُ بِهٖ وَیَدُهُ الَّذِیْ یَبْطَشُ بِهٖ)) جس کا ترجمہ یہ ہے کہ بندہ مجھ سے قرب حاصل کرتا جاتا ہے حتی کہ میں اس کو محبوب بنالیتا ہوں اور اس وقت میں اُس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اس حدیث کے الفاظ بہت صریح ہیں اس باب میں کیونکہ حتی کا لفظ موجود ہے جو انتہاء پر دال ہے اور انتہا قرب ہی کی بیان فرمائی تو مطلب یہ ہوا کہ انتہائی درجہ قرب کا یہ ہے حاصل یہ کہ ایک قول یہ بھی ہوا جو بعض کے کلام سے نکلتا ہے کہ محبوبیت اخیر مقام ہے۔

تصوف کی اصطلاح مقام کے مختلف نام اور اس کی تشریح

غرض اتنے اقوال ہوئے اس باب میں کہ بعض نے رضا کو اخیر مقام کہا ہے اور بعض نے فنا کو اور بعض نے عبدیت کو اور بعض نے محبوبیت کو ان سب میں تعارض نہیں بلکہ تلازم ہے کیونکہ رضاء کامل بدون فنا کے نہیں ہوتی پھر جب رضا اور فنا کے بعد لازم ہے نزول، اس کا نام بقاء رکھو یا عبدیت دونوں کا حاصل ایک ہی ہے اور ان میں غایت قرب لازم اور غایت قرب کے لئے محبوبیت لازم ہے تو نام ان مقامات کے کچھ رکھ لو مگر سب آپس میں ایک دوسرے کے لازم ہیں۔ یا یوں فیصلہ کیا جاسکتا ہے ان اقوال میں کہ مقامات کا اخیر تو رضاء ہے اور احوال کا اخیر فنا

ہے یہ سب عروج ہیں اور نزول کا اخیر ہے عبدیت، اور محبوبیت کو چاہے کسی میں داخل کردو خواہ عروج میں خواہ نزول میں اس طرح سب اقوال منطبق ہوگئے یہ فیصلہ ہے ان اقوال کے بارے میں۔

دین میں اعلیٰ درجہ کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے

اب میں اس غایت اور غرض کو عرض کرتا ہوں جس کی نسبت ابتداء وعظ میں کہا تھا کہ جیسے پرسوں کے بیان سے غرض ایک غلطی کا اظہار تھا ایسے ہی آج کے بیان سے غرض ایک بات کی شکایت ہوگی۔ وہ یہ کہ دین میں تکمیل سے قبل قناعت کیوں ہوجاتی ہے اور اس مضمون تکمیل کی تحقیق کے لئے ضرورت ہوتی تھی انتہائی مرتبہ کے بتلانے کی، جب میں اس کو بیان کرچکا تو اب میں اس شکایت کو زبان پر لاتا ہوں اور وہ شکایت اتنے بیان سے بخوبی سمجھ میں بھی آگئی ہوگی کیونکہ یہاں سے مقصود یہی ہوتا ہے کہ جو باتیں بیان کی جاتی ہیں وہ حاصل کرو مگر میں تصریحاً بھی اس کو دوہراتا ہوں یعنی جب معلوم ہوگیا کہ انتہائی مقامات یہ ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ دیکھ لیں کہ ہم میں یہ پیدا ہوئے ہیں یا نہیں اور جب تک نہ ہوں برابر کوشش جاری رکھیں ان سے پہلے قناعت کرکے کیوں بیٹھ رہتے ہیں۔ کبھی دہلی جانے والے کو بھی دیکھا ہے کہ ایک منزل ادھر پہنچ کر بس کردی ہو بلکہ خاص شہر دہلی کے باہر بھی رہ جانا اس کو گوارہ نہیں ہوتا بلکہ شہر میں پہنچ کر بھی وہ جگہ اختیار کرتا ہے کہ بقدر اس کے امکان کے اعلیٰ سے اعلیٰ ہو بلا مبالغہ ہے کہ اگر بس چلے تو کوئی بھی شاہی محل کے سوا کسی گھر اور سرائے میں بھی نہ اترے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ دین میں منزل مقصود سے ادھر قناعت کرلی جاتی ہے کیوں اس وقت کوشش جاری نہیں رکھی جاتی جب تک کہ یہ مقامات حاصل نہ ہوجاویں۔

اندریں رہ می تراش ومی خراش تادم آخردمے فارغ مباش
دم آخر دم آخر بود کہ عنایت با تو صاحب سر بود(۱)

دُھن میں لگے رہو۔ کوئی وقت خالی نہ ہو اور ناامید نہ ہو اور یہ مت سمجھو کہ ہم کو یہ مقامات حاصل نہیں ہو سکتے طلب میں لگے رہو ان شاء اللہ تعالیٰ مقصود حاصل ہوگا۔ یہ تحقیق ہوئی انتہائی مقام کی اور جو کچھ اس کے مناسب تھا عرض کیا گیا۔

آیت سے مسائل تصوف کا اثبات

اب اس آیت پر منطبق کیجئے اور اس پر میں بیان کو ختم کردوں گا فرماتے ہیں: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ رَءُوْفٌم بِالْعِبَادِ﴾ یہ دو جملے ہیں اور ایک میں دو دو مقام مذکور ہیں: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ﴾ اس میں مقام فنا کا ذکر ہے کیونکہ شراء کہتے ہیں بیچ ڈالنے کو تو جو چیز بیچ ڈالی جاوے اس میں بائع کو کسی تصرف کا حق نہیں رہتا وہ چیز مشتری کی ہو چکی اور جب اپنی جان بیچ ڈالی تو وہ چیزیں جو جان سے ادنیٰ درجہ کی ہیں بطریق اولیٰ بک گئیں تو اپنی تو کوئی چیز بھی نہیں رہی اور کسی تصرف کا اختیار نہ رہا یہ فنا ہے اس کے آگے دوسرا بقا ہے: ﴿اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط﴾ یعنی یہ معاملہ ہوا رضاء الٰہی کے حاصل کرنے کے لئے اس میں صاف الفاظ میں مقام رضا مذکور ہے ایک جملے میں فنا و رضا دونوں کا ذکر ہو گیا دوسرا جملہ: ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌم بِالْعِبَادِ﴾ اس میں بھی دو لفظ ہیں۔ ایک میں ایک مقام مذکور ہے اور دوسرے میں دوسرا، حق تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ رؤف ہیں۔ رافت کہتے ہیں غایت رحمت کو اس سے زیادہ

(۱) ''اس راستہ میں خوب کوشش کر آخر دم تک بیکار مت رہ یہاں تک کہ تیری موت کا وقت قریب آجائے، شاید اللہ تعالیٰ تجھ پر عنایت فرمائیں''۔

رحمت کیا ہوسکتی ہے کہ بندہ کو محبوب بنالیں یہ مقام محبوبیت ہوا اور یہ معاملہ ہے کس کے ساتھ بالعباد بندوں کے ساتھ یعنی جنہوں نے مقام عبدیت حاصل کرلیا ہے۔ لیجئے چاروں مقام اس آیت میں مذکور ہیں یہ وہی آیت ہے جس کو لوگ روزمرہ پڑھتے ہیں اور اہل علم بھی۔ برابر پڑھتے چلے جاتے ہیں مگر کبھی اس طرف خیال نہیں جاتا کہ اس میں تصوف کتنا بھرا ہوا ہے۔ اس کا علم صحبت سے ہوتا ہے۔ اب قدر آتی ہے کہ اہل اللہ نے کیسا سمجھا ہے قرآن کو۔ ان کے واسطے سب کچھ قرآن میں موجود ہے اور دوسرے کو اس کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔ دیکھئے آیت میں دو جملے ہیں جن میں چاروں مقام کس وضاحت کے ساتھ مذکور ہیں اس تقریر سے میرا مقصود صرف بیان کو مزیدار کرنا نہ تھا بلکہ قرآن شریف کی بلاغت دکھانے کے ساتھ یہ بھی دکھلانا تھا کہ اہل تصوف کی باتیں من گھڑت نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ایک بات قرآن وحدیث کے مطابق ہے اور سیدھی سیدھی دل کو لگتی ہوئی ہے نہ تاویل وتحریف نہ اینچ پینچ بالکل عام فہم۔

خلاصہ مقصود

خلاصہ مقصود یہ ہے کہ اپنی حالت کو ٹٹولو اور سمجھ لو کہ جب تک یہ انتہائی مقامات پیدا نہ ہوں ہم ناقص ہیں کوشش کرتے رہو اور رفتار کو دھیمی نہ کرو اور مقصود سے ادھر قناعت نہ کرو اور ان کے حاصل ہوجانے کے بارے میں تمہاری خود کی رجسٹری معتبر نہیں ایسا بھی ہوتا ہے اور بہت ہے یہ بات کہ کوئی حالت اچھی پائی اور سمجھ لیا کہ ہم کو فلاں مقام حاصل ہوگیا بس خود ہی رجسٹری کرلی۔ اس کے رجسٹرار اللہ تعالیٰ ہیں جب عنداللہ حالت درست ہوجاوے تب اطمینان ہوسکتا ہے مگر اللہ میاں کسی کی تصدیق کرنے نہیں آتے اس واسطے سب رجسٹرار بھیج دیئے ہیں ان کی ہی تصدیق پر مدار ہے وہ سب رجسٹرار اہل اللہ ہیں۔ سب رجسٹرار کی تصدیق مانی جاتی ہے اگر اہل اللہ کی رجسٹری

ہوگئی تو کہا جاتا ہے ((طُوبٰی لَکُمْ)) مبارک ہو حق تعالیٰ کی نعمت اس کا شکر کرو مگر ٹھہرو اب بھی مت۔ سیر الی اللہ سے فارغ ہوئے دہلی کے دروازہ پر پہنچے ہو یہیں پڑاؤ مت ڈال دو بلکہ دہلی کی سیر کے لئے آئے ہو تو اندر جاؤ وہاں وہ چیز پاؤ گے کہ پھر دہلی سے کبھی نہ آؤ گے محنت اور مجاہدہ اور سفر کی صعوبات تو دروازہ پر ختم ہوگئیں۔ اب حظ ہے اور لطف ہے مگر ختم پر اور بھی مجاہدہ ہے۔ دہلی کے اندر بھی تو آخر پیروں ہی سے چلنا ہوگا اور جو جو چیزیں تفریح اور حظ کی ہیں ان کے پاس تک پہنچنے میں بھی تو نقل و حرکت کرنا ہوگی یہ بھی مجاہدہ ہے۔ غرض مجاہدہ کو ختم یہاں بھی نہ کرو اور اس مجاہدہ کی کہیں انتہا نہیں ساری عمر کا قصہ ہے غرض ابتدا کو بھی صحیح کرو یعنی توبہ کرو اس کو میں گذشتہ بیان میں ثابت کر چکا ہوں کہ وہ اول الاعمال اور اخیر کو مطمح نظر رکھو اور بلا پہنچے دم نہ لو۔ کسی جگہ قناعت نہ کرو جب تک اس فن کا ماہر نہ کہہ دے کہ پہنچ گئے یہ آج ثابت کیا گیا ہے۔

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم صحیح اور ہمت اور توفیق عطا فرمائیں۔ (۱)

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ تعالیٰ وسلم علیٰ خیر خلقہٖ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین۔

(۱) اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو صحیح سمجھ اور عمل کی توفیق عنایت فرمائیں۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

ناجی اور ناری

''میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ایک تسبیح بھی نہ پڑھے مگر گناہ چھوڑ دے، غیبت نہ کرے، جھوٹ نہ بولے اور غیر خدا کی محبت سے دل کو خالی کر دے اور ایک نفل بھی نہ پڑھے، ایک تو ایسا ہو اور دوسرا ایسا ہو کہ ساری رات جاگے عبادت کرے، قرآن شریف پڑھے لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو حقیر سمجھے، ان کو تکلیف پہنچائے، اور بھی گناہ کرے تو خوب سمجھ لو کہ پہلا ناجی ہے اور دوسرا ناری ہے''۔

وعظ: ترک المعاصی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ